از: ڈاکٹر علی شریعتی

علیؑ — ایک دیومالائی سچ

ترجمہ: سیّد محمد موسٰی رضوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

[illegible]

از: ڈاکٹر علی شریعتی

علیؑ — ایک دیومالائی سچ

ترجمہ: سیّد محمد موسیٰ رضوی

نام کتاب		علیؑ ...... ایک دیومالائی سچ علیؑ اور تنہائی علیؑ کی ضرورت۔ کیوں اور کس لئے علیؑ کے پیروکار اور ان کے دکھ تاریخ اور علیؑ
مصنف		ڈاکٹر علی شریعتی
ترجمہ		سید محمد موسیٰ رضوی
پروف ریڈنگ		سید آل حسن رضوی
کمپوزنگ		احسان علی
سنہ اشاعت اول	.	۲۰۰۰ء
سنہ اشاعت دوم	.	۲۰۰۵ء
ناشر		ادارہ "ن و القلم"
قیمت		۱۰۰/=

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نہج البلاغہ کا وہ خطبہ جسے علی شریعتی نے گویا اپنی ایک تقریر سے پہلے سر آغاز کے طور پر حاضرین کے سامنے پڑھنے کی ہدایت کی:

اسرار کے در کھول رہے ہیں خاموش
حکمت کے گہر رول رہے ہیں خاموش
اے پیک محل شناس جبریل امیں
اس وقت علیؑ بول رہے ہیں خاموش
(جوشؔ)

اے لوگوں ہم ایک ایسے کج رفتار اور ناشکر گزار دنیا میں پیدا ہوئے ہیں کہ جس میں نیک دل اور پاک دامن شخص کو خطاکار سمجھا جاتا ہے اور ظالم اپنے غرور اور نخوت کی آندھی کو تیز تر کرتا جاتا ہے۔

جن چیزوں کو ہم جانتے ہیں ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور جن چیزوں کو نہیں جانتے انہیں دریافت نہیں کرتے اور جب تک مصیبت آنہیں جاتی ہم خطرہ محسوس نہیں کرتے۔

لوگ چار طرح کے ہیں:

کچھ وہ ہیں جو زمین میں فتنہ انگیزی سے باز نہیں آتے مگر یہ کہ ان کی طاقت طاق، تیغ کند اور ہاتھ خالی ہو جائے۔

اور کچھ وہ ہیں جو تلواریں سونتے ہوئے شر پھیلا رہے ہیں، انہوں نے اپنے سوار اور پیادے جمع کر رکھے ہیں۔ اور کچھ مال بٹورنے یا کسی دستہ کی قیادت کرنے یا منبر پر بلند ہونے کے لئے انہوں نے اپنے نفسوں کو وقف کر دیا ہے اور اپنے دین کو تباہ و برباد کر ڈالا ہے۔

کتنا بُرا سودا ہے کہ تم دنیائے دنی کو اپنے نفس کی قیمت اور اللہ کے یہاں کی نعمتوں کا بدل قرار دے لو۔

اور کچھ لوگ وہ ہیں جو دنیا کے کاموں سے آخرت طلبی کے بجائے آخرت والے کاموں سے دنیا طلبی کرتے ہیں۔ یہ اپنے اوپر بڑا سکون و وقار طاری رکھتے ہیں، قدم آہستہ آہستہ اٹھاتے ہیں اور دامنوں کو پرہیزگاری کے مد میں اوپر کی طرف سمیٹتے رہتے ہیں اور اپنے آپ کو اس طرح سنوارتے ہیں کہ لوگ انہیں امین سمجھیں اور اللہ کی پردہ پوشی سے فائدہ اٹھا کر گناہ کرتے ہیں۔ (توحید کے خرقے تلے مت چھپاتے ہیں، نظروں سے پوشیدہ مئے ناب کی صراحی پی جاتے ہیں اور لوگ انہیں مستند سمجھتے ہیں)

اور چوتھے وہ لوگ ہیں جن کے نفسوں کی کمزوری اور ساز و سامان کی نافراہمی انہیں ملک گیری کیلئے اٹھنے نہیں دیتی۔ ان کی بیچارگی نے ان میں بیچارگی کی خو پیدا کی ہے۔ انہوں نے اپنے ضعف و فقر و ذلت کی زندگی سے سمجھوتہ کر کے قناعت کے نام سے اپنے آپ کو آراستہ کر لیا ہے اور زاہدانہ لباس سے خود کو سجا لیا ہے حالانکہ نہ گھر میں، نہ گھر سے باہر، نہ دل میں اور نہ زندگی میں انہیں کبھی کسی وقت بھی ان چیزوں سے لگاؤ نہیں رہا ہے۔

اس زمانے میں کچھ ہی لوگ ایسے رہ گئے ہیں جن کی آنکھیں آخرت کی یاد اور حشر کے خوف سے جھکی ہوئی ہیں اور ان سے آنسو رواں رہتے ہیں۔ ان میں کچھ تو وہ ہیں جو دنیا والوں سے الگ تھلگ تنہائی میں پڑے ہیں اور کچھ خوف و ہراس کے عالم میں، ذلتیں سہ رہے ہیں، اور بعض نے اس طرح چپ سادھ لی ہے کہ گویا ان کے منہ باندھ دیئے گئے ہیں، کچھ خلوص سے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ کچھ غم زدہ اور درد رسیدہ ہیں جنہیں خوف نے گمنامی کے گوشہ میں بٹھا دیا ہے اور خستگی اور درماندگی ان پر چھائی ہوئی ہے۔

وہ ایک کڑوے اور شور دریا میں ہیں (کہ باوجود پانی کی کثرت کے پھر وہ پیاسے ہیں) ان کے منہ بند اور دل مجروح ہیں۔ انہوں نے

لوگوں کو اتنا سمجھایا بجھایا کہ وہ اکتا گئے اور اتنا ان پر جبر کیا گیا کہ وہ بالکل دب گئے اور اتنے قتل کئے گئے کہ ان میں (نمایاں) کمی آ گئی۔

پس اے لوگو! اس طرح کی دنیا کو تمہاری نظروں میں کیکر کے چھلکوں کی اس گاد سے جو چمڑا رنگنے والوں کی رنگائی کے بعد بچ جاتی ہے اور اون کے ان ریزوں سے جو اون کاٹنے والوں کی قینچی سے گرتے ہیں، زیادہ حقیر اور پست ہونا چاہئے۔

پس اس سے قبل کہ تمہارے حالات سے بعد والے عبرت حاصل کریں اور نیز اس دنیا کی برائی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس سے قطع تعلق کرو اس لئے کہ اس نے آخر میں ایسوں سے قطع تعلق کر لیا جو تم سے زیادہ اس کے والہ و شیدا تھے۔

❁❁❁❁❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم
[illegible]

مُقدمہ

انسان ایک ایسی ہستی ہے جو آغاز تاریخ سے ہر وقت اپنی اور دنیا کی حقیقت کے بارے میں سوچتا رہا اور آج بھی یہ دونوں چیزیں اس کے لیے مجہول ہیں۔ اسے نہ آغاز کا علم ہے اور نہ انجام کا۔ وہ ایک ایسی بے خبر ہستی ہے جو درمیان سے اُبھری اور آج تک اپنی شناخت کے کرب میں گرفتار ہے اسے "نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم" کھوج کی اذیتناکیوں نے اسے مضمحل کر دیا۔ آغاز خلقت بشر سے انسان اپنی روزمرہ کی تمام مصروفیات کے بعد خالی وقت میں بیٹھ کر اپنے اور کائنات

کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ اسے اس بات کا احساس ہوتا تھا کہ وہ اس عالم مادہ سے ہٹ کر کوئی اور شئے ہے یا اس میں کوئی اور اضافی چیز شامل ہے۔ اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ سب کچھ رکھنے کے باوجود وہ کسی انجانی چیز کا محتاج ہے مگر ضرورت کی چیز اس کے ذہن میں اپنا نقش مرتب نہیں کرتی تھی۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اسے کس چیز کی تلاش ہے۔ بس یہی کہ وہ اس کائنات کی جنس نہیں ہے۔ دنیا کے ساتھ اس کی بیگانگی کے احساس نے اسے ایک دائمی اضطراب اور قنوطیت میں مبتلا کر دیا اور وہ تنہائی محسوس کرنے لگا اور پھر اسی احساس نے اس کے ذہن میں وطن اور عالم غیب کی تمنا کو بیدار کیا۔ وہ عالم غیب جو اس کے رہنے کا اصل مقام ہے۔ تاہم وہ اس کے محل وقوع اور کیفیت سے ناواقف تھا۔ اچھی، خوبصورت اور تمام نعمتوں سے مالا مال دنیا کا تصور ہر ثقافت، ہر مذہب اور ہر فلسفے میں مشترک

رہا ہے۔ انسان پہلے سے یہ محسوس کرتا رہا ہے کہ اسے اپنی موجودہ کیفیت سے بلند تر ہونا ہے، نجات حاصل کرنا، اور زیادہ بہتر تک پہنچنا ہے۔ اسے اس دنیا کی ہر چیز میں کھوٹ دکھائی دیا۔ کوئی اچھائی، کوئی زیبائی اور کوئی صفت اسے یہاں خالص اور مکمل دکھائی نہیں دی اور اسی لیے اس نے اپنی تسلی اور اعلیٰ مثالی نمونوں کے لیے دیومالائی داستانیں تراشیں۔

انسان اپنی قانونی اور قابل تبصرہ زندگی کے آغاز سے آج تک واضح طور پر اپنے عقائد و اعمال اور خیالات و خواہشات میں مثالی نمونوں کا خواستار رہا ہے۔ یہ ایمانی، عملی، اور فکری تلاش اُس فکری جہت کے مقابل ہیں کہ جہاں تمام کوششیں عام زندگی کو سنوارنے میں صرف ہوتی ہیں ایک بنیادی جہت کی حیثیت رکھتی ہے۔ دیومالائی داستانیں وہ قدیم فکری ذخائر ہیں جس میں انسان کی مطلق پرستی اور مطلوب مطلق کے مظاہر کمالات

کی پوری جھلک موجود ہے۔ انسان ان داستانوں کے
ذریعے اپنی تلخیٔ حیات کو مٹانا چاہتا ہے اور اپنے لیے مثالی
نمونے تلاش کرتا ہے، ماقبل تاریخ کے بدوی انسان سے آج
کی متمدن یورپی دنیا تک سب دیومالائی صورتیں تراشنے
میں مشغول ہیں۔ اب آپ اس کتاب میں دیکھیں گے کہ
ان دیومالائی مظاہر نے انسان کی معنوی حیات میں کیا
کردار ادا کیا اور اس داستان میں علیؑ کون ہے اور کیا ہے؟
بے شک علیؑ کا شمار تاریخ کی ایک جہت رکھنے والی
شخصیتوں میں نہیں ہوتا آپ کی شخصیت کے مختلف پہلو اور
مختلف زاویے ہیں۔ جب ہم گہری نگاہوں سے اس مجموعۂ
صفات ذات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے
کہ گویا ہم عالم محسوسات سے ماوراء کسی معقول کو دیکھ رہے
ہیں۔ یہ پرتوں اور تہوں میں چھپی ہوئی ذات کسی کی سمجھ میں آجائے

تو خطِ وجوب و امکان بن جاتی ہے، اور سمجھ میں نہ آئے تو
ماورائے حس و ادراک ہو جاتی ہے۔ مگر اس سمجھ اور ناسمجھی
کے درمیان بھی ضعف و ناتوانی عقل کی ایک منزل ہے
جس میں ہم دیکھتے ہیں کہ علی بن ابی طالبؑ کو معاویہ اور
معاویہ منش انسانوں کے ساتھ ایک ہی ترازو میں تولا جارہا ہے
ہر ایک نے اس ذات گرامی کو اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھنے
کی کوشش کی ہے مگر ہماری نگاہ اس ذات اقدس پر ہے
جس نے ہر زاویہ نگاہ سے علیؑ کو دیکھ کر یہ کہا کہ یہ وہ ممثل صفات
حق بندہ ہے جسے یا میں نے پہچانا ہے یا پھر خدا نے۔ علیؑ کو وہ
افراد کیوں پہچانیں گے جن کے نزدیک زندگی نوی نفس کے سوا
کچھ بھی نہیں۔ ہم ایک ایسے انسان کی گفتگو کر رہے ہیں جو
زندگی کے لیے اعلیٰ مقاصد کا حامل ہے، جو حکمرانی میں عادل
مطلق، معرفتِ عالم و آدم میں یکتا، زندگی کے اعلیٰ بنیادی

اصولوں پر کاربند، اقدار انسانی کا آئینہ دار، خدا سے براہ
راست متصل، تقویٰ و فضیلت کا خداوند، گفتار و کردار کا
غازی، مجسمۂ طہارت و عصمت اور نیک اندیشی اور نیک
افکاری کا مرقع ہے اور یہ تمام باتیں عمومی اقدار و مفاہیم کے
ساتھ انسان کی شناخت سے پہلے موجودہ معاشرہ کے لیے
قابل توضیح و تفسیر نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر علی شریعتی نے اپنی تقریر کے آغاز میں
جواب کتابچہ کی صورت میں آپ کے سامنے ہے سب سے
پہلے انسان پر بحث کی ہے اور ایک خاص نقطۂ نگاہ اور ایک
خاص مفہوم کے ساتھ اسے پیش کیا ہے اور اس بات پر زور
دیا ہے کہ جب تک انسان کی شناخت نہیں ہوتی اس وقت
تک اعلیٰ مراتب سے متعلق مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ اس مفہوم
کو لوگوں کے اذہان میں راسخ کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب

علیؑ کے کردار کو انسان کے مقابل پیش کرتے ہیں یہاں
ایک تو انسان کی شناخت خود ایک دشوار مسئلہ ہے اس
پر علیؑ کی معمائی، معجزاتی اور عجائبات بھری زندگی سے
متعلق گفتگو اور آپ کی زندگی کے پیچیدہ گوشوں کی بات
دشوار تر ہے۔

ان سب باتوں کو پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب
کہتے ہیں کہ علیؑ وہ مجموعہ کل صفات ہیں جن کی ہمیشہ
انسان کو تلاش رہی ہے اور اس تلاش میں ناکام ہو کر اس
نے بالآخر دیومالائی قصوں کا سہارا لیا۔

مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ ہمارے نوجوان
اسقدر بیدار ہیں کہ باوجود اس کے کہ عوام فریب اور
عالم نما اور تیز روشن خیال نما لوگوں نے علی شریعتی پر
مسلسل کیچڑ اچھالی، ان کی تکفیر و تحقیر کی اور طرح طرح

کے الزامات ان پر دھرے اور لوگوں کی توجہ کو ان کی
طرف سے ہٹانے کی کوشش کی مگر ان بیدار مغز لوگوں
نے انہیں اپنے سینے سے چمٹائے رکھا اور ان کی تحریروں
اور تقریروں کا اور زیادہ گہری نگاہوں سے مطالعہ کیا، ان
کی کتابوں کی فروخت میں مزید اضافہ ہوا اور ان کا چہرہ
آسمانِ احساس پر اور زیادہ تابناکی سے چمکنے لگا۔

اور یہ ابھی کی بات نہیں اس وقت بھی جب
ساواک نے، کتب خانوں، کتب فروشوں اور گھروں پر
چھاپے مارے اور علی شریعتی کی کتابوں کی ضبطی عمل
میں آئی اور پھر بھی اس کی تحریروں اور نیز شائقین میں
کمی نہیں آئی تو ساواک کے ایک اہلکار نے جھلا کر کہا تھا:
"خدا مارے شریعتی کو، اس کی کتابیں زمین سے پھوٹتی
ہیں، "شہادت" کو سمیٹتے ہیں تو "تشیع علوی" آتی ہے،

اسے سمیٹتے ہیں تو "ذکر و ذاکرین" آتی ہے، اسے
سمیٹتے ہیں تو "امت و امامت" آتی ہے، اسے سمیٹتے
ہیں تو "باپ کے نام خط" آتی ہے، اسے سمیٹتے ہیں تو
"بیٹے کے نام خط" آتی ہے، کیا یہ کمبخت نیند میں
بھی لکھتا ہے"۔

یہ تو اس وقت کی بات تھی مگر آج بھی اس کی
کتابوں کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ آپ کے ہاتھوں میں
موجود کتاب کا یہ تیسرا ایڈیشن ہے جو شائقین کے بے
حد اصرار اور تین سال کی مسلسل اور پیہم فرمائش کے بعد
اب دوبارہ منظر عام پر لائی جا رہی ہے، البتہ اس دفعہ ہم
نے علی شریعتی کے چار اور کتابچوں: "علیؑ اور
تنہائی"۔ "علیؑ کی ضرورت کیوں اور کس لئے"۔ "علیؑ کے
پیروکار اور ان کے دکھ"۔ اور "تاریخ اور علیؑ" کو

بھی اس میں ضمیمہ کیا ہے اس لئے کتاب کی ضخامت میں اضافہ ہوا ہے۔

ہم قارئین کرام کے مشکور ہیں کہ انہوں نے علی شریعتی کے برسوں کی زحمت کو ضائع ہونے نہیں دیا اور بڑھ چڑھ کر ان کی کتابوں کا استقبال کیا اور کر رہے ہیں۔

اب آخر میں، میں اپنے پڑھنے والوں سے یہ درخواست کروں گا کہ اس شہید راہ حق کے آستانہ پر سبع مثانی کی تھالی سجا کر اپنی عقیدتوں کا اظہار کریں جس کے جسد خاکی کو مظلوم حسینؑ کی مظلوم بہن جناب زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا نے اپنی بارگاہ میں دائمی عزت سے سرفراز کیا۔

سورہ فاتحہ

حلقہ بگوش خاندان نبوی
سید محمد موسیٰ رضوی

Ali as Reflection of Myths

علیؑ
ایک دیومالائی سچ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلی شب

۱۰ مارچ ۱۹۶۸ء

معذرت خواہ ہوں کہ میری آج شب کی گفتگو بڑی ثقیل اور تھکا دینے والی ہوگی۔ اس کی وجہ ایک تو اس موضوع میں شاید ہمیشہ سے بڑھ کر میری بے بضاعتی ہے کیونکہ یہ ایک نہایت حساس اور بے انتہا پیچیدہ موضوع ہے اور میں اس کے سامنے عاجزی کا اظہار کرتا ہوں، اور دوسرے اس مسئلہ میں میری روش اور میرا اندازِ نظر جسے میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں ایسی خصوصیت کا حامل ہے کہ جس کے بیان کے لیے بڑی پختگی کی ضرورت ہے۔

موضوع بہت اہم ہے۔ "علیؑ" کے بارے میں گفتگو نہایت دشوار ہے، کیونکہ میرے نزدیک علیؑ صرف نمونۂ شجاعت اور ایک تاریخی شخصیت نہیں ہیں۔ علیؑ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور مختلف زاویوں کا جائزہ لینے والے تحقیق کی منزل میں اپنے آپ کو تنہا ایک فرد کے مقابل نہیں بلکہ نوعِ بشر کے ایک برجستہ ترین اور ممتاز ترین شخصیت کے سامنے پاتے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ اپنے آپ کو ایک معجزے، ایک علمی مسئلے اور اس خلقت کے ایک علمی معمے کے روبرو دیکھتے ہیں۔ اس بنا پر "علیؑ" کے بارے میں گفتگو فوری طور پر ذہن میں آنے والی پہلی سوچ کے برخلاف ایک عظیم شخصیت کے بارے میں گفتگو نہیں ہے بلکہ تاریخ کے ایک ایسے معجزہ کے بارے میں گفتگو ہے جو انسان کے نام سے انسان کی صورت میں نمودار ہوا۔ علیؑ کو مختلف سمتوں سے دیکھنے اور مختلف زاویوں

سے پرکھنے کی ضرورت ہے۔ کبھی ہم آپ کی شخصیت کو، آپ کے کردار کو اور آپ کے مقام و منزلت کو تاریخ اسلام کے اعتبار سے دیکھتے ہیں اور اس رُخ سے آپ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فکر کا یہ رُخ خاص مسائل کے ایک سلسلہ کو محقق کے سامنے لاتا ہے اور خوش قسمتی سے "علیؑ" کو سمجھنے کا یہ پہلو دیگر تمام پہلوؤں سے زیادہ روشن اور زیادہ واضح ہے اگرچہ یہ پہلو بطور مطلق یعنی خود "علیؑ" کی نسبت پھر بھی غیر واضح ہے۔ کبھی ہم "علیؑ" کو ایک مورخ کی حیثیت سے پرکھنا اور سمجھنا چاہتے ہیں یعنی علیؑ کا وہ کردار جسے آپ نے تاریخ بشر یعنی تاریخ اسلام کے اہم ترین اور حساس ترین ادوار میں پیش کیا۔ اس منزل پر پھر کچھ نئے مسائل سے ہماری مڈبھیڑ ہوتی ہے اور ہمارے سامنے علیؑ کی فتح و شکست، معاشرے میں آپ کا مقام، آپ کی اجتماعی اور سیاسی رہبری، لوگوں سے آپ کا رابطہ، آپ کی حریت پسندی، آپ کی سیاسی اور اجتماعی شخصیت، سیاسی رقیبوں سے آپ کا مقابلہ اور وہ حالات و کیفیات جو آپ کی زندگی و آپ کی موت کے بعد تاریخ اسلام کا مقدر بنے مجسم ہوتے ہیں اور محقق کو انہیں ایک خاص انداز میں پرکھنے کی ضرورت ہے۔

"علم الانسان" یا (ETHNOLOGY) کا موضوع تیسرا نقطۂ نظر ہے جس کے زاویۂ نگاہ سے علیؑ کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ہم تاریخ اسلام میں آپ کی شخصیت کو، آپ کی منزلت اور حقانیت کو شیعہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک اور زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور آپ کو مجموعۂ عجائب پاتے ہیں۔ اس منزل پر جو مسائل ایک محقق کے سامنے آتے ہیں وہ ان مسائل سے مختلف ہیں جو ایک مورخ، ایک مسلمان یا ایک شیعہ کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ یہاں جن مسائل کا سلسلہ قائم ہوتا ہے

اس کا تعلق نفسیات، فلسفے اور خاص طور پر "علم الانسان" سے ہے۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ ابھی تک اس سلسلے میں کوئی کام نہیں ہوا ہے، اور اسی لئے میری یہ کوشش ہے کہ میں اس علم کی روشنی میں علیؑ کی شخصیت کے پیچیدہ گوشوں کو، ان کے معجزات اور عجائبات بھری زندگی کو تحقیق کی منزل پر لاؤں، اور اس بنیاد پر میں اس عظیم ہستی کو تاریخ بشریت اور نفس بشریت میں قرار دے کر مطالعہ کی منزل پر لاتا ہوں اور اس کو "علیؑ اور انسان" کا عنوان دیتا ہوں۔ انسان اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ اپنے تمام آئیڈیلز، خواہشات اور معنوی تعمیری کیفیت کے ساتھ مخصوص خصائل کا حامل ہے۔ اس کی بعض خاص تمنائیں ہیں۔ ان تمناؤں میں، ان آرزوؤں میں اور ان مخصوص بشری خصائل میں "علیؑ" کی عظیم معجزاتی شخصیت اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ اس اعتبار سے اس اہم مسئلہ پر گفتگو بہت مشکل ہے کہ "علیؑ" بشریت اور انسانیت میں کس خاص مقام کے حامل ہیں کیونکہ اس امر میں ایک تو علیؑ کی پہچان ضروری ہے جو ایک عظیم شخصیت کی شرح حال یا بیوگرافی پر موقوف نہیں بلکہ ایک دشوار فلسفہ اور دشوار علمی معمہ ہے اور اس کے بعد ایک اور پیچیدہ اور مجہول موجود یعنی انسان کی شناخت کی ضرورت ہے جو علم الانسان میں مجہول ترین موجود مانا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس "عید غدیر" کو صرف شیعوں اور صرف مسلمانوں کے حق میں نہیں بلکہ "انسان" کے حق میں مبارک باد دیتا ہوں۔

مجھے یہاں دو راتوں کی تقریر کا حکم دیا گیا ہے اس لئے قاعدتاً جس گفتگو کو مجھے ایک جلسہ میں مکمل کرنا تھا اسے آج کی حد تک ادھورا چھوڑنا پڑے گا اور بحث کے دوسرے حصے کو آج کی بحث سے ملا کر ہمیں کل نتیجہ تک پہنچنا ہوگا۔ آج رات مجھے صرف "انسان" پر ایک خاص نقطۂ نگاہ اور ایک خاص مفہوم کے ساتھ گفتگو کرنا ہے اور

پھر کل شب انسان کی شناخت کے بعد "علیؑ" کے کردار کو اس انسان کے مقابل پیش کرنا ہے اور آخر میں آخری نتیجہ کے طور پر مفہوم "امام" پر گفتگو کا سلسلہ ختم ہوگا!

"انسان" شاید ایک بہت ہی پرانا موضوع ہو اور فوری طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے ایک بڑے واضح اور روشن موضوع کو عنوان بحث قرار دیا ہے حالانکہ علم الانسان اور اس سے متعلق تمام علوم اور تمام علمی انکشافات میں مجہول ترین اور مشکل ترین مسئلہ "انسان" ہے جب ہم ارسطو سے لے کر آج تک اس کے بارے میں اتنی مختلف تعریفیں پڑھتے اور سنتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا اتنی غیر معمولی سائنسی پیش رفت کے باوجود "انسان" کی نسبت ہر شے کی بہتر تعریف کر سکتی ہے کیونکہ بقول "الیکسیس کارل" "انسان اب تک باہر کی دنیا میں گھومتا رہا ہے۔ اسے ہمیشہ اس عالم خاک، مادی اشیاء اور اس سے متعلق انکشافات کی جستجو رہی۔ اس نے کبھی اس بات پر توجہ نہیں دی کہ باہر کی دنیا سے پہلے اپنے اندر کی دنیا کا کھوج لگائے....." اندرونی دنیا سے میری مراد وہ باطن نہیں ہے جو صوفیا کا مطمح نظر رہا ہے بلکہ اس سے میری مراد "انسان" ہے کیونکہ ہر شے سے پہلے، ہر تمدن کی تشکیل سے قبل، ہر ثقافت اور ہر مکتب کو وجود میں لانے سے پہلے "انسان" کی شناخت ضروری ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمیں "انسان" کے علاوہ ہر چیز کی شناخت ہے۔ خاص طور پر ان حالیہ تین صدیوں میں جس تناسب سے سائنس نے ترقی کی ہے اور جس تناسب سے انسان نے اشیاء اور فطرت سے متعلق معلومات حاصل کی ہیں بقول "جان ڈیوی" آج اسے گزشتہ سے بھی کمتر "انسان" کی معرفت حاصل ہے، کیونکہ اس نے

پہلے سے زیادہ اپنے افکار اور علمی کاوشوں کو بیرونی دنیا کی تحقیق پر صرف کیا ہے۔"

مذہب اور قدیم علوم کے نعروں میں مفہوم زندگی، مقصود عالم اور اس دنیا میں انسان کی ذمہ داری کو سمجھنے کی بات تھی جسے علماء اور فلسفہ دانوں نے اپنی حد تک نتیجہ خیز بنایا لیکن ان میں کوئی بھی منزل تک نہ پہنچ سکا اور اب ان حالیہ تین صدیوں میں "فرانسیس بیکن" نے ایک ایسے نعرے کا انتخاب کیا جسے سائنس نے آج تک اپنے لئے محفوظ کر رکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ: سابقہ علوم اور سابقہ فلسفے کا کام یہ تھا کہ انسان حقائق عالم کے بارے میں اپنی معلومات بڑھائے اور بس۔ مگر آج کی سائنس کو اس منزل سے آگے بڑھنا ہے اور پچھلے بوجھ کو اپنے کاندھے سے اتار کر نئی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالنا ہے جیسا کہ ہوا اور جس فریضے کو اس نے سہارا دیا وہ قوت و طاقت سے متعلق تھی۔ "فرانسیس بیکن" نے اعلان کیا: "صرف وہی علم، علم ہے اور وہی فلسفہ، فلسفہ ہے جو انسان کی قوت و قدرت کا سرچشمہ ہو" اور جیسا کہ آج ہم دیکھ رہے ہیں سائنس کی اتنی تیز پیش رفت نے انسان کے طاقتور ہونے میں مدد دی ہے اور انسان کے طاقتور ہونے کا مقصد فطرت پر اس کی تسخیر ہے اور فطرت کی تسخیر اس لئے ہے کہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں، مادی خواہشات اور مادی نعمات سے جس قدر ہو سکے بہرہ ور ہو۔ یہ کوشش اس بات کا سبب بنی کہ ان حالیہ تین صدیوں کی سائنس اور فلسفی موضوعات کا رخ انسان کو زیادہ طاقتور بنانے یا بہ الفاظ دیگر صنعت کو ترقی دینے کی طرف ہو۔ اس بنا پر سابقہ علوم اور سابقہ فلسفوں کا مقصد دنیا کے بارے میں انسان کی معرفت تھی لیکن آج کی سائنس کا مطلب علمی اور سائنسی کوششوں کو "صنعت" کی طرف

لے جاتا ہے، اس لئے کہ صرف صنعت ہی وہ ذریعہ ہے جو علم کو انسان کی طاقت و توانائی میں بدلتا ہے۔ پہلے دانشمند وہی تھا جو زیادہ خود آگاہ اور زیادہ معلومات کا حامل ہو مگر آج بقول "بیکن" اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آج دانشمند وہی ہے جو زیادہ صاحب قدرت اور زیادہ صاحب اسلحہ ہو۔ یعنی آج کی دُنیا میں زیادہ صاحب ثروت، دانشمند ہے اور بس... پچھلے دَور میں "آمن" دانشمند تھا اور "رم" صاحب قوت۔

آج علم و دانش کا کام صرف اور صرف انسان کو روئے ارض پر صاحبِ قدرت بنانا ہے یہ قوت و طاقت، یہ نعرہ... اگرچہ ایک اچھا اور قابلِ احترام نعرہ ہے کیونکہ انسان کو مادّی نعمتوں سے مالامال کرنا بھی علم کا کام ہے لیکن علم کو صرف اسی ایک رُخ اور اسی ایک ذمہ داری پر منحصر کرنا علم اور انسان دونوں کے ساتھ خیانت ہے اور آج اس کے عواقب ہمارے سامنے ہیں۔ اس لئے کہ انسان کو انسان بنانا اسے قوت و طاقت بخشنے سے بدرجہا بہتر ہے اور بقول "بیکن" علم یا سائنس نے انسان کو صرف صاحبِ قدرت بنانے میں مدد دی ہے اور اس کی معنوی بہتری اور برتری سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے انسان کو ہر دور کے انسان سے زیادہ فطرت پر تسلط ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنی نسبت تاریخ کے تمام ادوار کا ناواقف اور نادان ترین انسان ہے اس طرح کہ اگر ہم گزشتہ ادوار میں کسی صاحب علم و دانش سے یہ پوچھ بیٹھتے کہ۔ زندگی کس چیز سے عبارت ہے؟" "انسان کیا ہے؟"۔ "عالم عبث ہے یا نہیں ہے؟" ... تو وہ کم از کم کچھ جواب تو دیتا اور اپنے آپ کو ان بنیادی مسائل کے مقابل

ذمہ دار محسوس کرتا جو ایک عرصے سے انسان کی تحقیق کا مرکز تھے اور جنہیں حل کرنے کے لئے سائنس کو اپنی کوششیں جاری رکھنی چاہیے تھیں۔ لیکن آج اگر ہم کسی عالم کے سامنے یہ سوال اُٹھاتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ وہ مسائل ہیں جن تک ہم کبھی نہیں پہنچ سکتے اور جنہیں کبھی حل نہیں کیا جا سکتا۔ بہتر یہی ہے کہ اس پر وقت صرف نہ کیا جائے اور اس کے بارے میں نہ سوچا جائے۔ میرا مقصد اور میری ذمہ داری یہ ہے کہ میں حقائق کو یا واقعات کے درمیانی رابطہ کو دریافت کروں اور اس پر دسترس حاصل کرکے اسے صنعت کے حوالے کروں اور انسان کو اشیاء میں اور زیادہ استحکام بخشوں۔

اس بنا پر انسان کی تمام فکری اور معنوی کوششوں کا مقصد صنعت کا عروج ہے اور صنعت کا مقصد پیداوار اور استعمال ہے۔ گویا انسان کی تمام گہری، مقدس، معنوی عقلی اور منطقی کوششوں کا خلاصہ وہ ایجادات ہیں جو انسانی زندگی کے تنوع اور استعمال کے عمل کو بڑھاتی ہوں اور اسی لئے آج کا تمدن ایک مصرفی تمدن ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ مادّی یا مصرفی حقیقت آج کی تمدن کا خلاصہ ہے۔ تمام متمدن دُنیا میں ہر قسم کی حکومت اور ہر قسم کے اجتماع پر نظر ڈالئے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ اس اَمر میں سب کی راہ اور سب کا نقطۂ نظر یکساں ہے اور اس میں کسی کو کوئی شک نہیں۔ مصرفی اشیاء پر انسان کی آتنی شدید توجہ نے آج کے انسان کو گھٹا دیا ہے۔ اس نے انسان کو صاحبِ قدرت بنایا ہے مگر بُرائی کے معاوضے کے ساتھ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ انسان صاحبِ قدرت ہونے سے پہلے اچھی صفات کا حامل ہوتا۔

اس منزل پر میرے لئے دو اصطلاحوں کی وضاحت ضروری ہے جو زیادہ تر

مترادف استعمال ہوتی ہیں جبکہ وہ مترادف نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک نوعِ بشر کی خدمت اور دوسرے نوعِ بشر کی اصلاح ہے۔ یہ دونوں دو الگ مفہوم اور دو الگ مقولے ہیں۔ کبھی ہم ایک فرد یا ایک اجتماع کی خدمت کرتے ہیں مثلاً کسی شہر کی پکی سڑکوں کی تعمیر کرتے ہیں یا کسی شخص کو کچھ رقم دیتے ہیں اس کے لئے مکان فراہم کرتے ہیں تو یہ کسی معاشرے یا کسی شخص کی خدمت ہوگی لیکن اصلاح نہیں کہلائے گی۔ . . اسے اصلاح نہیں کہتے۔ . . ممکن ہے اصلاح سے عاری یہ خدمت خیانت کی سبیل بن جائے۔ اگر میں اصلاح کرنے سے قبل کسی انسان کی خدمت کروں تو گویا میں نے اس خدمت کے ذریعے اس کی کجروی اور گمراہی میں مدد دی ہے لہٰذا ہمیں خدمت سے پہلے انسان کے اصلاح کی فکر کرنی چاہیے . . . . . اور سائنس صرف انسان کی خدمت کرتی ہے اور اس کے اُچھے اور بُرے ہونے سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ وہ انسان کے اصلاح کی پابند نہیں ہوتی۔ آج دُنیا میں ایسا کون سا علم ہے جو نوعِ بشر کے اخلاقی اصلاح کی ذمّہ دار ہو؟ وہ کونسا علمی موضوع ہے جو انسان کو انسانی بزرگی پر فائز کرے؟ اس روشن اُفق پر ہمیں خلا ہی خلا نظر آتا ہے۔ تمام علومِ انسان کو زیادہ مُقتدر بنانے کے لئے فطرت سے مزید آگاہی کے درپے ہیں حالانکہ علم کی زیادہ مقدّس، زیادہ مقدم اور زیادہ فوری ہدایت انسان کی اصلاح اور اس کی شناخت ہے کیونکہ کسی فرد کو پہچاننے سے پہلے کہ وہ کس قسم کا انسان ہے، یہاں کیوں رہنا چاہتا ہے، اس کے رہن سہن کا انداز کیا ہے، کن خیالات کا حامل ہے اس کے لئے کسی مکان کی تعمیر وہ کتنی ہی خوبصورت، حسین اور جدید تعمیرات سے مُزیّن کیوں نہ ہو بے سُود اور بے معنی ہے۔ اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم انسان کی شناخت سے پہلے اسکی

خصوصیات اور زندگی کے مفہوم کو سمجھے بغیر ترقی یافتہ جدید، طاقت ور اور عالیشان تمدن کے پیچھے دَوڑ رہے ہیں اور ممکن ہے ہماری تمدن کو اس اعتبار سے چار چاندلگ جائیں لیکن چونکہ اس کا ڈھانچہ انسانی زندگی کی شناخت ہدایت اور مفہومِ حیات کی حقیقتوں پر استوار نہیں اس لئے ممکن ہے یہ اپنی پوری عظمت اہمیت اور عالی مقامی کے ساتھ کسی وقت بھی انسان کو "مسخ" کر دے۔ میں نے ممکن ہے کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن اس عمارت میں زندگی بسر کرنے والے مفکرین "ممکن ہے مسخ کر دے" کے بجائے "مسخ ہو گئے ہیں" کا جملہ استعمال کرتے ہیں۔

تمام نئے دَور کے صاحبانِ فن، لکھنے والے، ہنرمند اور مجسمہ سازوں کو دیکھا جائے تو سب کے سب "مسخ" کے عظیم ہیرو نظر آئیں گے اور یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے۔ ہم دُور بیٹھے یورپ کی تمدن کے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتے۔ وہ لوگ جو خود اس تمدن میں جی رہے ہیں ان سے پوچھنے کی ضرورت ہے کہ وہ کیا محسوس کرتے ہیں اور اپنے آپ کو کیسا پاتے ہیں۔ اس ماحول اور اس طور طریقے میں کس قسم کا انسان نشو ونما پا رہا ہے؟ . . . . روٹرڈم میں کوئی گیا ہو تو اسے معلوم ہوگا کہ وہاں ایک مجسمہ ہے جو واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ روٹرڈم وہ شہر ہے جو دُوسری جنگِ عظیم میں مکمل طور پر زمین بوس ہو گیا تھا اور اب جو شہر اس پر آباد ہوا ہے وہ جدید ساخت کا ایک نہایت منظم شہر ہے۔ وہاں کی تمام سڑکیں، عمارتیں اور پارک وغیرہ انتہائی مُناسبت کے ساتھ تکمیل کو پہنچے ہیں اور اس تنظیم کے ساتھ یہ کام صرف روٹرڈم ہی میں انجام پا سکتا تھا اس لئے کہ جنگ نے اسے بالکل ایک میدان بنا دیا تھا اور نئے منصوبے کے ساتھ پورے شہر کی تعمیر عمل میں آئی تھی۔ اس شہر

کے ایک عام میدان میں پتھر کا ایک مجسمہ دکھائی دیتا ہے جو حقیقتاً قدرتی پتھر کا نہیں ہے اس کے تمام اعضاء ایک دُوسرے سے الگ ہیں۔ سر، ہاتھ، پیر، گردن، زانو، ہر حصّہ دوسرے حصّہ سے جُدا ہے گویا بکھرے ہُوئے اعضاء کا ایک مجسمہ ہے جو دُور سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دَوڑ رہا ہو۔ روڈ ڈم کا یہ مجسمہ آج کے انسان کا مجسمہ ہے جو جنگ کے بعد کے اِنسان اور دَورِ جدید کے اس انسان کی عکاسی کر رہا ہے جس نے قوت و طاقت حاصل کر لی ہے۔ جیسا کہ "بیکن" نے کہا ہے: اس نے وہ قوت حاصل کر لی ہے کہ گویا پتھر کی طرح مضبُوط ہو گیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ ٹوٹ کر بکھر رہا ہے اور کسی وقت بھی مکمل تباہی سے دوچار ہو سکتا ہے۔

سارتر کی کتاب کا شمار بیسویں صدی کی مشہور ترین کتابوں میں ہوتا ہے جس میں آج کے اِنسان کی بڑی عمدگی سے عکاسی کی گئی ہے۔ "استفراغ" اس کتاب کا نام ہے۔ ژان ایزولہ کا ہیرو سر سے پاؤں تک سونے میں ڈوبا ہوا ایک پُرشکوہ اور باجاہ و جلال شہزادہ ہے۔ مگر وہ ایک دردِ بے درماں کے ہاتھوں فریادی ہے۔ "ژان ایزولہ" اپنے اس ہیرو کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ ہیرو فرانس ہے، سر سے پاؤں تک سونے میں ڈوبا ہوا سراپا تمدن اور سراپا "زر" یعنی زندگی کی تمام آسائشات اس کے ساتھ ہیں۔

گویا "بیکن" کے اس فلسفہ نے وجودی شکل اختیار کی جسے اس نے علم کے بارے میں کہا تھا (یعنی وہی علم، علم ہے اور وہی فلسفہ، فلسفہ ہے جو انسان کی قوت و قدرت کا سرچشمہ ہو) لیکن وہ ایک ایسے درد میں مبتلا ہے جس کی کوئی دوا نہیں۔ "ژان ایزولہ" کے مُطابق یہ شہزادہ مملکت فرانس ہے لیکن آج ہم اسے ہر متمدن دُنیا

سے نسبت دے سکتے ہیں۔

"ایلیٹ" ایک دوسرے ہیرو کو سامنے لاتا ہے۔ وہ آج کے مقتدر انسان کو کہیں زیادہ دلچسپ انداز میں پیش کرتا ہے ... "تایرزی" یا "تریزی" قدیم یونان کا ایک مخنث دیوتا ہے اور یہ دیوتا انگلستان کے سب سے بڑے نامور نقاد، مشہور شاعر اور صاحبِ قلم کا ہیرو ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "ایلیٹ" آج کے دَور میں انگلستان کا سب سے بڑا ادیب اور سب سے بڑا ادبی تنقید نگار ہے۔ اس کا ہیرو آج کا اِنسان ہے جو مقتدر ہو گیا ہے کل کے اِنسان سے دُگنا، لیکن کیسا دُگنا؟ ایک مخنث کی طرح، وہ مخنث جو عام اِنسان سے دُگنا ہے مگر عقیم ہے اور اس سے زیادہ کمزور ہے اور انسانی اعتبار سے اس گزشتہ اِنسان کی سطح سے پست تر ہے جو اس کا نصف تھا۔ آخر ایسا کیوں ہُوا۔ اس طاقت اور اس برجستگی کے ساتھ پھیلنے والے اس تمدن، اس علم اور اس نبوغ کے باوجود آخر کیوں "روڈ ڈم" کا مجسمہ تعمیر ہوا؟ اتنا ابہت و جلال، اتنی طاقت اور آسائشات سے بھری زندگی نے آخر کیوں "استفراغ" کی صُورت اختیار کی، آخر کیوں اس عظیم تمدن کو ایک بیماری لگ گئی جو بقول "کامو" طاعون ہے؟ اور پھر کس لئے وہ اِنسان جو گزشتہ اِنسان کے مقابل دُگنا ہو گیا ہے، مخنث ہے ... آخر کیوں ... میری نظر میں اس لئے کہ سب سے پہلے انسان کی شناخت ضروری تھی۔ سائنس کو چاہیئے تھا کہ وہ پہلے انسان کی شناخت کرتا اس کی زندگی کے مفہوم کو پیش کرتا اور پھر تمدن کی طرف آگے بڑھتا اور ایسے صنایع، ایجادات اور دیگر ساز و سامان پر توجہ دیتا جو اس کے لئے ضروری تھا، لیکن اس نے کبھی انسان کی شناخت نہیں کی۔ زمین پر انسان کی زندگی سے متعلق اس کے پاس کوئی سوچ نہیں ہے۔

بس تعمیرات کا ایک سلسلہ ہے یہ سوچے بغیر کہ ان عمارتوں میں رہنے والوں کی حقیقی اور اصل ضرورتیں کیا کیا ہیں؟ ہمیشہ جدید طرز کی عمارتوں کی گفتگو ہے جو پچھلی عمارتوں سے زیادہ مضبوط، زیادہ مکمل اور زیادہ جدید طرز پر بنائی گئی ہیں اور یہ بات درست بھی ہے لیکن جب ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اس میں رہنے والے انسان کی خصوصیت کیا ہے وہ کس قسم کا آدمی ہے تو جواب ملتا ہے اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ یہ بات تو فلاں قدیم دانشور سے متعلق ہے جس نے اس سلسلے میں بڑی گفتگو کی ہے لیکن وہ بھی کسی نتیجہ تک نہیں پہنچا تو بس پھر ہمیں بھی اس پر توجہ کی ضرورت نہیں ... پھر آخر یہ تمدن کس لئے بنائی جا رہی ہے۔ تمدن بنانے، سائنس کی راہیں معین کرنے اور سائنس یا فلسفہ پر ذمہ داری کی نوعیت عاید کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی فکری توانائیوں کو اس بات پر صرف کریں کہ انسان کس نوعیت کا موجود ہے، وہ کون ہے؟ اس کی خصوصیات کیا کیا ہیں۔ اسے کن بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے اور اس کی خصوصیات کیا کیا ہیں؟ اور اس شناخت کی بنیاد پر ہم تمدن کی تعمیر کریں اور پھر اس کی اساس پر علم کے ابلاغ کا تعین کریں۔

اس مقدمہ سے میری مراد یہ تھی کہ تمدن، فلسفے، ادبیات، زندگی یہاں تک کہ مذہب اور فلسفہ کی شناخت ان کے تجزیے اور قضاوت سے پہلے انسان کی شناخت ضروری ہے وگرنہ مذہب انسان کے کمال، اس کی زندگی اور نجات کا راستہ ہے اور انسان کی عظیم ترین اور عمیق ترین مسائل کا جواب گو ہے۔ اس بنا پر تعریف مذہب کے لئے پہلے انسان کی شناخت ضروری ہے اگر ہم انسان کو پہچان لیں اور اس کی شناخت کر لیں تو ہم اس کے لئے بہترین مذہب کا انتخاب بھی کر سکتے ہیں

اور یہ سمجھ سکتے ہیں کہ تمام مذاہب میں اس موجود کے لیے کونسا مذہب زیادہ مناسب ہے۔ آج رات یہاں میری کوشش ہوگی کہ میں اپنے اور دوسروں کے خیالات اور مطالعات کی روشنی میں آپ کو انسان کی شناخت کراؤں اور یہ بتاؤں کہ انسان سے میری مراد کیا ہے اور وہ کونسی اہم ضرورتیں ہیں جو پوری تاریخ میں ہمیشہ اس سے وابستہ رہی ہیں؟ اور پھر یہ بتاؤں کہ اس انسان کے مقابل "علیؑ" کا مقام کیا ہے اور جس قسم کی زندگی روئے ارض پر انسان کو گزارنی ہے اس میں "علیؑ" کی منزل کیا ہے؟

مختلف مذاہب اور خاص کر مذہب اسلام کی رو سے انسان کی شناخت کے لئے ہر امر سے پہلے فلسفہ خلقت پر توجہ ضروری ہے۔ اکثر بڑے مذاہب خلقت سے متعلق اس فلسفہ کے حامل ہیں جس میں انسان کی ساخت اور پیدائش پیش نظر ہے کہ وہ کس طرح عالم وجود میں آیا....؟ خلقت سے متعلق ان داستانوں اور فلسفوں میں زیادہ تر انسان کی کیفیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاریخ ادیان میرے تحقیق و تدریس کا موضوع ہونے کے اعتبار سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسلام میں انسان کی خلقت کا فلسفہ اسلام کے خوشگوار ترین چہرہ کا آئینہ دار ہے (جس پر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بہت کم توجہ دی گئی ہے) اور یہ فلسفہ اس قدر عجیب و غریب اور باعظمت ہے کہ انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ انسان کی خلقت کے مسئلہ میں اس کی شناخت کے لئے سیکڑوں رموز و نکات مضمر ہیں جس کا استخراج انسان کے حقیقی مفہوم کو اپنے تمام جزئیات کے ساتھ عرصۂ ظہور پر لاتا ہے یہاں میں طوالت کی بنا پر اس کی تفصیلات میں نہیں جا سکتا اس لئے کہ سال گزشتہ

اس مسئلہ پر کام کرتے ہوئے مجھے قرآن اور روایات کی رو سے آدم کے قصے میں انسان کی شناخت پر مبنی پچاس سے زیادہ نکتے ملے ہیں اور اگر انشاء اللہ آئندہ کوئی فرصت ہاتھ آئی تو میں اسے آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں گا لیکن میں ایک ایسے مسئلہ پر تکیہ کرتا ہوں جسے آپ لوگ سب جانتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اسلام کی رُو سے انسان جمع ضدین ہے جس کا ایک سرا ایسے متعفن ترین، منفور ترین اور پست ترین شئے سے وابستہ ہے جس سے زیادہ حقیر چھوٹا اور پست لفظ لغت بشر میں نہیں ملتا . . . "صلصال کالفخار" . . . میں یہاں اس کے علمی مفہوم کو پیش نہیں کر رہا ہوں علمی مفہوم کے لئے ایک جداگانہ بحث کی ضرورت ہے۔ میں اخلاقی اعتبار سے اس داستان کا تجزیہ کر رہا ہوں۔ یہ "حماٍ مسنون" سے ہے، مٹی سے ہے، کیچڑ سے ہے . . . . یہ انسان کا ایک سرا ہے ایک رُخ ہے، پھر اس کیچڑ کو اس "حماٍ مسنون" کو کس نے بنایا، یہ کیسے بنا، خداوند عالم نے اس کی تخلیق کی . . . اس کے بعد اس نے اس کے دوسرے سرے اور دوسرے پہلو کو بنایا جو خدا اور روح خدا سے وابستہ ہے۔

یقیناً میں نے یہاں اَدبی تعبیر سے کام لیا ہے۔ خدا اور رُوح خدا "ید اللہ" کی طرح ایک اَدبی تعبیر ہے۔ تو انسان کی تعمیر میں ایک جُز متعفن کیچڑ سے متعلق ہے جبکہ دوسرے جُز میں رُوح خدا ہے جو اس میں پھونکی گئی۔ اس بنا پر یہ موجود دو جز پر مشتمل ہے کہ جہاں وہ ایک طرف تو پست ترین اور ارزل ترین سطح سے متصل ہے اور دُوسری طرف بزرگی اور عظمت کی اس چوٹی سے ہمکنار ہے جہاں رُوح خدا پھونکی گئی اور اَب ہم تمام انسان، سب کے سب کیچڑ اور مٹی، اور خدا اور رُوح خدا کے انہی دو اقطاب کے دَرمیان محوِ حرکت ہیں اور یہی ہمارا راستہ ہے، انسانی زندگی کا راستہ۔ وہی راستہ

جو "حماٍ مسنون" بدبُودار کیچڑ سے نکلتا ہے۔ جہاں پستی ہے۔ حقارت ہے۔ خواری ہے وہ ایک گندھی ہوئی مٹی ہے اسے تہ نشینی کی عادت ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ اسی طرح اپنی جگہ پڑا رہے . . . اور پھر اس کی منزل کا دوسرا سرا "مطلق" ہے۔ اس میں رُوحِ خدا موجزن ہے۔ اس بنا پر اس داستان میں حیاتِ انسانی اور اس کی ذمہ داریوں کو واضح کیا گیا ہے۔ پس انسان وہ ہستی ہے جو مٹی سے خدا تک کے فاصلہ کو طے کرنے کی راہ میں ہے اور اس راہ کا نام مذہب ہے اور اسی کی ذات منزل و مقصودِ بشر ہے۔

یہ وہ مفہوم ہے جسے اسلام نے انسان کے بارے میں پیش کیا ہے۔ کیا انسان کے بارے میں اس سے زیادہ برتر مفہوم بھی ممکن ہے۔ یا انسان کو مطلق طور پر تمامیت بخشنے والے گویا تمام انسان پرست مکاتب میں دورِ ایتھنز سے اَب تک ان تین ہزار سالوں میں اس نظریہ سے متعلق جتنے بھی فلاسفر گزرے ہیں ان میں سے کسی نے بھی انسان کی اس انداز میں اس بلندی کے ساتھ تعریف نہیں کی ہے۔ اس دور میں "سارتر" اور "ہائیڈگر" مذکورہ نظریہ کے سب سے بڑے حامی اور وجود پرست تصوّر کئے جاتے ہیں۔ مجھے اگر فرصت ملی تو میں اس پر گفتگو کروں گا کہ انسان کو سب کچھ سمجھنے والے سارتر، ہائیڈگر یا مارشل جیسے لوگ جو انسان کو فطرت کی تخلیق گردانتے ہیں اور اسے کوئی اور ہی مخلوق سمجھتے ہیں یہاں تک کہ ان کے نزدیک انسان کی وہ عظمت ہے کہ اسے خدا اور واجب الوجود کی ضرورت بھی لاحق نہیں ہوتی، انسان کی داستان میں اسلام کے مفہوم سے زیادہ پست اور مفہوم کے قائل ہیں یہ ہے انسان کی ذمہ داری سے متعلق وہ حقیقت جسے اسلام نے پیش کیا۔

تاریخ، تاریخ میں انسانی نفسیات، تمام بشری ثقافتیں، آرٹ اور ادبیات

سے متعلق تمام صورتوں میں خواہ وہ اس کی بدوی اور صحرائی زندگی ہی کا دَور کیوں نہ ہو جہاں اس کے پاس پہننے کے لئے کوئی لباس اور رہنے کے لئے کوئی گھر نہیں تھا..... زمین پر اس کے رہنے بسنے اور کھیتی باڑی کی زندگی کے دَور سے اب تک پوری انسانی تاریخ، ہر تمدن اور ہر ثقافت میں جو چیز وجہ مشترک ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی روزمرہ کی تمام مصروفیات کے بعد خالی وقت میں بیٹھ کر اپنے اور کائنات کے بارے میں سوچا کرتا تھا اور یہ سوچ اسے ایک اندوہ میں مبتلا کرتی تھی۔ یہ اندوہ اور یہ دغدغہ انسانی تاریخ کے تمام اظہارِ خیال کے ذرائع میں پوری آب و تاب کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ادبیات، مصوری اور وہ تمام افکار و عقائد جو قدیم انسانوں نے حتیٰ دَورِ اوّل کے صحرانشینوں نے ہمارے لئے چھوڑی ہیں اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ انسان اس دَور میں بھی یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ ان درختوں، پہاڑوں، جانوروں اور پرندوں کی جنس نہیں ہے بلکہ کوئی شے اس میں اضافی ہے۔ اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ سب کچھ رکھنے کے باوجود وہ کسی انجانی چیز کا محتاج ہے، مگر وہ چیز کیا ہے اس کا اسے علم نہ تھا؟ دُنیا کے ساتھ اس کی اس بیگانگی کے احساس نے ایک دائمی دغدغہ و اضطراب کو اس میں جنم دیا اور اسی اضطراب و دغدغہ نے اسے قنوطیت میں مبتلا کر دیا۔ وہ ہر شئے سے مایوس ہو گیا جس میں یہ زندگی اور تمام عالم شامل ہے۔ زندگی اور اس عالم سے مایوسی اس کی فطرت کا حصہ ہے کیونکہ تمام تاریخی ادوار میں یہ کیفیت واضح ہے اور ہر نسل میں اس کا وجود پایا جاتا ہے۔ کوئی ثقافت ایسی نہیں جو اس محسوس حقیقت سے خالی ہو۔ میں نے اس مسئلہ کو بڑی تفصیل کے ساتھ پورے تاریخی اسناد کو سامنے رکھ کر لکھا ہے مگر چونکہ یہاں اس کی گنجائش نہیں اس لئے صرف عناوین کی حد تک میں اس کا تذکرہ کروں گا۔

عالم کے بارے میں ایک گونہ کمی کا احساس اور یہ بات کہ گویا اس کی ذات میں کچھ اضافی شئے موجود ہے اور وہ عالم کی تمام موجودات سے زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔ انسان کی ذات اور فطرت میں شامل ہے کیونکہ یہ تصور اس سے کبھی جدا نہیں ہوا۔ اسے ہمیشہ یہ احساس رہا کہ اس بھری کائنات میں اس کے لئے کوئی کمی موجود ہے۔ اسے کسی چیز کی ضرورت ہے مگر وہ کیا ہے یہ بات اس پر پوری طرح واضح نہیں تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اسے ایک ایسی چیز کی ضرورت ہے جسے اس کی دسترس میں واقع ہونے والا یہ تمام عالم محسوس بھی اسے نہیں دے سکتا۔ اس احساس اور اس اعتقاد نے اسے احساسِ محرومی میں مبتلا کر دیا۔ انجانے کمی کے احساس نے اس کے وجود میں جڑیں دوڑا دیں اور اسے تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ مادے سے غیر متجانس ہونے کا احساس اس کی ذات کا حصہ ہے۔ یہاں تک کہ آج کے خدا سے لاتعلق فلسفی کے ذہن میں بھی دوسرے عالم کا تصور اور یہ احساس کہ وہ اس عالم میں بیگانہ ہے اپنا نقش جمائے ہوئے ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ عالم اس کے لئے نہیں۔ اسے بیگانگی کا احساس ہوتا ہے وہ یہاں اپنے لئے کوئی کمی محسوس کرتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات اُبھرتی ہے کہ وہ یہاں کا نہیں ہے کسی اور مقام کا باسی ہے جو اس سے زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے اور یہی مقام اس کے شایانِ شان بھی ہے اور یہیں اس کی تمام ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ثقافتوں کی تاریخ پر نظر دوڑاتے ہیں اور اس میں بدوی ثقافت پر ہماری نگاہ جاتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی زمانے کے انسان کے ذہن میں جس فلسفے نے اپنا نقش قائم کیا تھا وہ

دو دُنیاؤں کا تصور تھا۔ پانچ ہزار سال قبل مسیح کی تاریخ میں ہمیں "ہدس" یا "ہودس" نام کے دو لفظ ملتے ہیں جسے بین النہرین کے رہنے والے سُمیریوں نے اپنے قبل کی کسی قوم سے لیا تھا جس کا مفہوم عالم ماورائے آب و گل ہے اور یہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے اور یہ ثبوت فراہم کرتی ہے کہ عالم سے متعلق ابتدائی زمانے کے انسان کے ذہن میں جو پہلا خاکہ مرتب ہوا وہ "دُوسری دُنیا" کا تصور تھا۔ اگرچہ وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا اور اس کے ذہن میں اس کا کوئی نقشہ مرتب نہیں تھا اس دُنیا سے اس کی بیگانگی، غیر متجانست اور ایک گونہ کمی کے احساس نے اسے ایک "بہتر عالم" کے اعتقاد سے ہمکنار کیا جو اس کے ہم جنس تھا۔ ثنویت عالم کا خاکہ وہ پہلا خاکہ ہے جو ان انسانوں کے ذہن میں مرتب ہوا جو تمدن کے ابتدائی آثار تک سے محروم تھے۔ دوسرا مسئلہ: اس کے احساس میں جو پہلا مسئلہ چھپا ہوا تھا(۱)... حتیٰ وہ انسان لباس سے عاری تھا۔ــــ علم الانسان اور (ETHNOLOGY) سے متعلق انیسویں صدی کی تحقیقات اور اٹھارویں صدی میں خاص طور پر "اسپنسر" اور "لوئی برول" کی تحقیقات نے یہ ثابت کیا کہ انسانی فکر میں پہلی مرتبہ جس مسئلہ نے جنم لیا وہ "تقدس" یا قداست کا مسئلہ تھا یعنی یہ چیز مُقدّس اور یہ دُوسری چیزیں معمولی، مادی اور احترام و توقیر کی منزل پر قابلِ ذکر نہیں ہیں... یہ تنے، یہ مہرہ، یہ شکل، یہ رنگ، پہاڑ کا یہ ٹکڑا مقدس ہے۔ کیوں اور کس لئے؟ یہ معلوم نہیں۔ اس تقدس کا سبب ہر قبیلہ میں مختلف ہے اور

(۱) اس مقام پر ٹیپ کی خرابی کے باعث مفہوم واضح نہیں، صرف یہی چند الفاظ سمجھ میں آتے ہیں: وہ پہلا مسئلہ..... چھپایا ہوا تھا۔

اس کے بالکل ہی ابتدائی اور بدوی اسباب ہیں جو بعد میں ان قوموں کے ساتھ ختم ہو گئے لیکن تمام بدوی اور مدنی ثقافتوں میں رہ جانے والی بات ایک تو اعلیٰ اور ادنیٰ صورتوں میں دو دُنیاؤں کا تصور ہے اور دُوسرے کُلی طور پر اشیاء عالم کا مقدس اور غیر مقدس ہونا ہے۔ خود یہ عقیدہ کہ بعض چیزیں مقدس ہیں، قابلِ ستائش ہیں، ان کی بے حُرمتی نہیں ہونی چاہیئے، انہیں عبادتگاہ کی زینت بننا چاہیئے اور ان کے آگے خضوع سے اپنا سر جھکانا چاہیئے اور ان کی تعظیم و تکریم میں کوئی کسر نہیں اُٹھانی چاہیئے در اصل انسان کے اس ابتدائی احساس کی پیداوار ہے جس میں وہ اپنے آپ کو اس عالم کی جنس قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک اس عالم سے ارفع و اعلیٰ کوئی اور دنیا بھی ہے۔

اس عقیدہ، اس احساس، دُوسری دُنیا سے متعلق انسانی رُوح اور فطرت کے اس میلان، ایمان بالغیب اور اس فکر نے کہ نہ جانے وہ جگہ کونسی ہے جس سے اس کی وابستگی ہے اور جہاں اس کی تمام ضروریات کو پُورا ہونا ہے اور جو اس کا دائمی مقام ہے اس فکر کو انسان میں جنم دیا کہ وہ عالم ــــ طاقت، قدرت اور نامرئی مقدس موجودات کا گھر ہے۔ اور یہ بدویوں کے ابتدائی مذاہب کی پہلی شکل تھی۔ لیکن تاریخ میں جس چیز نے اپنی صُورت نہیں بدلی وہ حق کے بارے میں انسان کی ثنوطیت اور اس کا گریز ہے۔ صرف انسان کے علم و فکر کی ترقی و تکامل نے انداز میں تبدیلی واقع کی ہے۔ یہ بات بھی اس کے ساتھ اٹل اور دائمی ہے کہ اس دُنیا میں تمام چیزوں کی موجودگی

کے باوجود اسے کمی کا احساس ہوتا رہا اور اسے یہ فکر لاحق رہی کہ وہ قیدی ہے، اسیر ہے، بیچارہ ہے۔ اس بیچارگی کے احساس نے اسے رنج و غم میں مبتلا کر دیا... ایک مبہم غم، بظاہر نظر آنے والا نہیں بلکہ ایک مبہم غم، یہ مبہم غم پوری تاریخ میں ہمیشہ انسان کے چہرے پر چھایا رہا اور ہم اسے تمام ادبیات، تمام عرفانی اور غیر عرفانی مذاہب اور دُنیا کے تمام بلند پایہ فنون میں دیکھتے ہیں اور اس کے اثرات کو اس انسان پر زیادہ مرتب پاتے ہیں جو زیادہ خود آگاہ اور زیادہ عمیق احساس کا مالک ہے۔ یہ وہ غم ہے جس کی فریاد ہم "گیلگمش" جیسی نامور شخصیت کی زبان سے سُن رہے ہیں جو پانچ ہزار سال پہلے "سمیر" کے آسمان تلے چلا رہا تھا: "میں یہاں کا نہیں ہوں، یہ عالم میرا نہیں ہے۔ میں اس زمین پر تنہا ہوں۔ یہ آسمان مجھ پر بوجھ ہے۔ اے میرے دیوتاؤ مجھے اپنے پاس اپنی دُنیا میں بُلا لو۔ مجھے اپنا راستہ دکھا دو تاکہ تمہارا سُراغ مل سکے۔ اے میرے دیوتاؤ میرے لئے راستے کی نشان دہی کر دو تاکہ میں یہاں سے، اس عالم سے نجات حاصل کروں... یہ لفظ "نجات" اور یہ "فلاح" — رستگاری اور بقول بُدھ "مکتی" پوری تاریخ بشر میں تمام مذاہب اور تمام ثقافتوں کا مدعا رہا ہے۔ نجات کا یہ تصور اس عقیدہ کی پیداوار ہے کہ انسان اس ناقص اور کمی کی حامل دُنیا میں اسیر ہے۔ اس دُنیا سے اس کا اتصال قائم ہے۔ اسے اس کی ضرورت بھی ہے لیکن نا خود آگاہ طور پر اسے یہ احساس رہا ہے کہ یہی کچھ یہ نہیں ہے۔ انسان کی زندگی مکمل ہو جائے، اسے ہر شئے مل جائے، آسائشات کی تمام چیزیں فراہم ہو جائیں تب بھی اس میں احساس الم

باقی رہتا ہے بلکہ اس میں شدت رونما ہوتی ہے۔ جب ہی تو طبقاتی نفسیات میں آج یہ کہا جاتا ہے: تمام رنج و غم اور تمام فلسفی اور معنوی دُکھ "بورژوا" کا حصہ ہے۔ اور یہ بات بڑی بامعنی اور حقیقت کے عین مطابق ہے۔ "بورژوا" کون ہے؟ "بورژوا" وہ ہے جو مرفہ الحال ہو جس کے پاس مادّے اور عالم سے متعلق ہر شئے موجود ہو، صاحب قوت و دولت ہو لیکن اسے بھی غم لاحق ہے۔ تاریخ میں موجود تمام مذاہب و مکاتیب عالم، عزلت پسندی اندوہناکی بے اطمینانی اور رنج و غم کا شکار رہے ہیں... آخر کیوں اس لئے کہ انہوں نے دُنیا کی ہر شئے کو حاصل کر لیا تھا لیکن جس دُنیا سے ان کی حقیقی وابستگی تھی اس سے متعلق کوئی شئے انہیں یہاں نہ مل سکی اور یہ دُنیا انہیں وہ چیز فراہم نہ کر سکی جس کے وہ متلاشی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عزلت پسندی، تلخ اندیشی، قنوطیت اور وہ فلسفی غم بیشتر ان افراد کا حصہ رہا ہے جو مرفہ الحال تھے اور یہ ایک انتہائی عمیق مسئلہ ہے اور اس چیز کو ظاہر کرتا ہے کہ انسان اپنی اس وجود ہستی سے بڑھ کر کوئی اور شئے ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان نے ہمیشہ اس دُنیا کے مقابل اپنے آپ کو زیادہ بیشتر اور زیادہ برتر ہستی کا حامل محسوس کیا ہے اور اس احساس نے اسے قنوطیت میں مبتلا کر دیا اور اس قنوطیت نے اس کی زندگی میں تلخی بکھیر دی اور اسے رنج و غم میں مبتلا کر دیا۔ لیکن اس تلخی اس قنوطیت، اس وسوسہ، اس تمنا اور کمی کے اس احساس نے اس میں نجات کی آرزو پیدا کی۔ وہ اپنی ان خواہشات تک پہنچنا چاہتا تھا جو یہاں اس کے لئے امکان پذیر نہیں تھی۔ یہ دُنیا اس کے لئے تنگ اور اسے اس کی خواہشات تک پہنچانے سے

عاجز تھی۔ منزل اور مدعا دونوں انسان کے لئے مجہول تھے۔ اس کے پیش نظر ہمیشہ یہ بات رہی کہ وہ جگہ کونسی ہے جس کا وہ متلاشی ہے اور وہ چیزیں کونسی ہیں جس کی اسے احتیاج ہے اور جس سے یہ دُنیا خالی ہے۔ ابتدائی زمانے یا آج کے متمدن انسان کے ان پیدا کردہ سوالات کے جوابات ہی ہیں جن سے مختلف مذاہب اور مختلف ثقافتوں کا ظہور عمل میں آیا اور جس سے آرٹ اور اَدبیات کی مختلف راہیں نکلیں۔ . . لیکن یہ سوال ہر دور اور ہر نسل کے انسان کا سوال رہا ہے۔ . . اس نے اپنے آئیڈیلز کے حصول کے لئے، اپنے صحیح مقام و منزلت کو پانے کے لئے، اس کمی کو دُور کرنے کے لئے جسے وہ اس عالم میں محسوس کر رہا ہے، اور ایک برترین انجانے عالم سے حصول تقرب اور ان مقدس چیزوں سے توسل کے لئے جو اس عالم کی جنس یا یوں کہنا چاہیئے مادی نہیں ہیں مختلف کوششیں اور مختلف راہیں تلاش کی ہیں۔ اس احساس سے ابتدائی مذہب کا وجود عمل میں آیا اور مذہب کے فطری ہونے کا یہی مفہوم ہے۔ قرآن نے لفظ "فطرت" کو بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے اور میں مذہب کو ایک غریزہ سمجھنے پر متفق نہیں ہوں۔ غریزہ اور فطرت ایک دوسرے کے قریب ہیں مگر ایک نہیں ہیں۔ "فطرت" انسان کی تعمیر سے تعبیر ہے اور "غریزہ" انسان کی سرشت اور اس کی فطرت میں سموئی جانے والی وہ خصوصیات یا وہ طاقتیں ہیں جو اس کو ناخود آگاہ (غیر ارادی) طور پر کسی سمت لے جائیں۔ لیکن مذہب یہ نہیں ہے۔ مذہب انسان میں رُونما ہونے والا ایک اندھا اور ناخود آگاہ غریزہ نہیں ہے۔ اس کا عمل غریزی نہیں فطری ہے۔ گویا اسے

خود آگاہ طور پر انسان کی ذات میں سمویا گیا ہے تاکہ وہ اس راستے کو تلاش کرے جو "نجات" کا راستہ ہے اور اس منزل پر پہنچ جائے جس کا اسے علم نہیں تھا اور جس کے احساس سے اس پر قنوطیت طاری تھی اور نہیں جانتا تھا کہ وہ کامل و اکمل مکان کونسا ہے جس کی وہ کمی محسوس کر رہا ہے اور جس کے آگے یہ دُنیا ناقص ہے۔ اسے اس نامعلوم دُنیا کی ہمیشہ تلاش رہی۔ اس نے کبھی اپنے آپ کو "اس دُنیا" کی (مادی) جنس نہیں سمجھا، اسے اپنا وطن قرار نہیں دیا۔ ہم پردیسی ہونے سے متعلق اس کی فریاد کو تاریخ کے ان انسانوں کی زبانی بھی سنتے ہیں جو ایک دوسرے سے مشابہت نہیں رکھتے۔ یہ متناقض افراد بھی اس دُنیا سے نالاں ہیں۔ سمیری اور بابل سے ابھی حالیہ حاصل ہونے والے کتبوں میں "گیلگمش" سے متعلق بابل کا کتبہ واضح طور پر ان فریادوں کا آئینہ دار ہے۔ وہ اپنی غم انگیز فریادوں میں دُنیا سے اپنی بیگانگی کا رونا روتا ہے اور یہاں سے نجات پانا چاہتا ہے لیکن اپنی منزل مقصود سے بے خبر ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ "علیؑ" کی بلند پایہ مجموعہ صفات ذات جو اپنے وجود میں عجائبات کی کُل کائنات سمیٹے ہوئے ہے ان لوگوں کے درمیان آگئی جو اس کے اہل نہ تھے۔ افسوس . . . کتنی سچائیاں، کتنی عظمتیں ان لوگوں کے ہاتھوں پامال ہوتی ہیں جو اس کے اہل نہیں ہوتے . . انجیل کی ایک عبارت ہے جو میرے نزدیک بڑی پسندیدہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر پوری انجیل تحریف شدہ ہو تو اس میں یہ عبارت زبان پیغمبرؐ کی گواہی دیتی ہے اور میرے خیال میں آسمانی کتاب کے محرفین میں اتنا شعور اور اتنی رسائی نہیں کہ وہ ایسا جملہ وضع کر سکیں۔ جملہ یہ ہے: اے لوگو! (اے بزرگی کے طلبگار انسانو) ان راستوں

سے نہ جاؤ جن پر چلنے والوں کی بہتات ہے بلکہ ان راستوں کو اختیار کرو جن پر چلنے والے کم ہیں۔۔۔۔ گویا اپنے لئے وہ راہ اختیار کرو جو عام ڈگر سے مختلف ہے۔ کیونکہ تاریخ اور حصولِ منزلِ کمال ان انسانوں سے وابستہ ہے جنھوں نے خود اپنے لئے اپنی راہیں معین کی ہیں اور ان راستوں کا انتخاب نہیں کیا جن پر بھیڑ چال ہے اور جہاں ہمیشہ دوسرے ان کے لئے سوچتے اور فیصلہ کرتے ہیں۔۔۔ ان راستوں سے جاؤ جن پر چلنے والے کم ہیں، ان راستوں سے نہ جاؤ جن پر چلنے والوں کی اکثریت ہے۔۔۔ علمائے قسطنطنیہ اس مضمون کی پیروی میں کبھی شاہراہوں سے نہیں گزرتے تھے بلکہ گلی کوچوں کا راستہ اختیار کرتے تھے۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ کبھی ایک سچائی، ایک گہرائی، ایک عظمت، ایک فکر، ایک گفتگو، ایک سوچ ان ذہنوں میں کتنی مضحکہ خیز بن جاتی ہے جو اس کے سمجھنے کے اہل نہیں ہوتے اور علیؑ کی ذاتِ گرامی ان عظیم ہستیوں میں سے ہے بلکہ میرے نزدیک۔ پیغمبرؐ کے ماسوا۔ عالمِ انسانیت کی وہ عظیم ترین ہستی ہے جو ایک خاص ہدایت پر مامور ہے۔۔۔ اور جو کل سے زیادہ آج انجانا اور اجنبی ہے، اور کاش انجانا اور اجنبی ہی ہوتا مگر آج فکر کی انتہائی پست منزلوں نے اسے چھونے کی کوشش کی ہے۔ کاش ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ محقق نے علیؑ کو میدانِ جنگ میں ایک ماہر شمشیر زن، محدود شہر میں نہایت حساس اور پر عمل سیاستدان اور گھریلو زندگی میں انتہائی شفیق، مہربان اور منظم فرد کی حیثیت سے دیکھا جو زندگی کے تمام شعبوں میں ایک بھرپور اور مکمل انسان کا نمونہ تھے۔۔۔ تاریخ کہتی ہے کہ آپ نصف شب کو لوگوں

کی نگاہوں سے چھپ کر اطرافِ مدینہ کے نخلستانوں میں جاتے اور کنوئیں کے دہانے پر اپنا سر رکھ کر فریاد کیا کرتے تھے۔ میں ہرگز یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ تمام کائنات پر برتری رکھنے والی اس روحِ پر فتوح کی فریاد کا باعث وہ رنج والم تھا جو آپ کو قومِ عرب، مدینے کے افراد، اسلامی معاشرے یا خود آپ کے ساتھیوں سے آپ کو پہنچا تھا۔ ہرگز نہیں۔ علیؑ کا درد و کرب اس سے کہیں سوا تھا۔ اس درد میں یقیناً وہ شدت ہوگی جس نے اس ہستی کو اتنا بے چین اور مضطرب کر دیا تھا۔ اور بلاشبہ یہ وہی انسانی دکھ ہے جس میں وہ اپنے آپ کو اس عالم کا اسیر پاتا ہے یہ تنگ اور کم مایہ دنیا اس کی تکامل طلب روح کی راہ میں حائل ہے۔ وہ یہاں ایک گھٹن محسوس کرتا ہے اور درحقیقت جس کسی میں زیادہ جوہرِ انسانیت ہوگا وہ زندگی کی ہر منزل میں اپنے اندر ضرورتوں کو زیادہ محسوس کرے گا کیونکہ انسان کی تعریف اس کی بھرپور بہرہ مندی میں نہیں بلکہ انسان اس ترازو کا جنس ہے جس کا وزن اس کی ضرورت اور نیازمندی ہے۔ اور یقیناً علیؑ کی ذاتِ گرامی ہر انسان سے بڑھ کر ان بلند پایہ ضرورتوں کو محسوس کرتی تھی جو اس عالمِ وجود میں ناپید ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس دنیا میں سب سے زیادہ بیگانہ محسوس کرتے تھے اور اس درجہ احساسِ بیگانگی کے سبب انہیں اس عالم میں سب سے زیادہ صدائے فریاد بلند کرنا تھا غم کی اس انتہا نے اس آسمانی ہستی کو کمال شدت سے اس طرح کی فریاد پر مجبور کر دیا۔۔۔ یہ میں۔۔۔ علیؑ کے بارے میں عرض کر رہا تھا۔۔۔ آج ہم اس فریاد کو ان زبانوں سے بھی سن رہے ہیں جو اصولاً نہ صرف یہ کہ

مثنا بر کس یا ماوراء الطبیعہ کے قائل نہیں بلکہ ان کی یہ کوشش ہے کہ ماوراءالطبیعہ اور خدا کے تصور کو ذہنوں سے مٹادیں اور انسان کو اس دُنیا کی ایک مطلق مادّی جنس قرار دیں اور عالم قدس، عالم برین اور خدائی، الٰہی اور ان تمام اخروائی اور ماورائی معنویات کی نفی کریں جو گزشتہ ادیان کا سرمایہ تھا۔ اور سارتر کا شمار انہیں افراد میں ہوتا ہے۔ اس نے اپنی تمام فکری اور فلسفی زندگی کو اس بات پر صرف کر دیا کہ انسان اپنے آپ کو یہاں صرف اور صرف اس زندگی سے وابستہ رکھے اور اس سے بلند تر اور بالاتر زندگی کی سوچ میں اپنا وقت ضائع نہ کرے۔

سارتر کی تمام فلسفی تحریروں میں اس کا یہ عقیدہ واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ انسان اور عالم وجود سے متعلق تمام حقیقتیں مادّے کی پیداوار ہیں۔ اس کا تمام فلسفہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ انسان اور اس عالم مادہ کے سوا اور کچھ نہیں جو کچھ ہے یہی ہے اور یہیں ہے۔

اس بنا پر انسان کو مایوسی کے بجائے پر اُمید ہونا چاہیے یعنی جو شخص انسان کو اسی دُنیا کی تخلیق جانے اور اسے اس کی جنس اور اسی کے مساوی قرار دے اسے اس عالم سے اُمیدیں وابستہ رکھنی چاہیے لہٰذا ایسے انسان کے لئے مایوسانہ گفتگو اور بیگانگی کی باتیں بے معنی ہو جاتی ہیں پھر اس کے دل میں نجات سے متعلق بھی کوئی دغدغہ، کوئی اضطراب اور کوئی تزلزل نہیں ہونا چاہیے اس لئے کہ دُوسری جگہ اور ہے کونسی جہاں جانے کے لئے اس کے دل میں بے چینی پیدا ہو یا نہ جانے اور اس سے دُور رہنے کا غم اسے لاحق ہو لیکن دلچسپ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ سارتر اپنے تمام اُدبی سرمایوں میں فلسفی سرمایوں کے برخلاف

فریاد کرتا نظر آتا ہے ... وہ مسلسل فریادی ہے ... وہ زندگی کو "استفراغ" (قے) سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ عالم پست، خام اور احمق ہے۔ آخر کیوں ساری حقیقتیں اور ساری تجلیاں اسی عالم کے دامن سے وابستہ ہیں پھر احمق کیوں؟ اس دُنیا کو خام اور احمق کہنے کا حق کس کو حاصل ہے؟ کون اسے دون و دنی کہہ سکتا ہے ... صرف وہی جو اس دُنیا کے علاوہ کسی اور دُنیا کو اس سے زیادہ اعلیٰ، ارفع اور اقدس جانتا ہو۔ جب کوئی اس کا معتقد نہ ہو اور انسان کو فطرت کی تخلیق جانے اور بس ... تو پھر یہ نالہ و فریاد کیسا؟!

سارتر کی تمام ادبیات اس فریاد سے معمور ہے کہ یہ دُنیا تنگ ہے اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ فہم و ادراک و احساس سے خالی ہے۔ یہ انسان سے مجانست نہیں رکھتی، انسان اس تمام عالم سے بالاتر ہے وغیرہ ... اور یہی اگزسٹینشلزم ہے۔ یعنی تمام عالم کہ ماہیت اس کے وجود سے پہلے ہے یعنی پہلے میں کسی چیز کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ کچھ بنانا چاہتا ہوں مگر بنانے سے پہلے اس کی ماہیت "یا کیفیت میرے ذہن میں ہوتی ہے پھر میں وہ چیز بناتا ہوں گویا میں اس ماہیت کو وجود بخشتا ہوں، مگر انسان کے بارے میں یہ تصور ہے کہ اس کی ماہیت اس کے وجود کے بعد بنی یعنی پہلے انسان پیدا ہوا۔ بالکل مہمل، بالکل واہیات، ہر خصلت و مفہوم سے عاری ... اس کے بعد اس نے اپنی ماہیت کو خود اپنے آپ بنایا۔ مجھے اس بات کی درستی اور نادرستی سے کوئی سروکار نہیں میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب ماوراءالطبیعہ

مینا فیزکس پر تمہارا ایمان نہیں اور تم اس عالم سے بالاتر عالم کے قائل نہیں ہو تو پھر کیوں علیؑ اور علیؑ جیسے عقائد رکھنے والے ان افراد کی طرح فریادی ہو جو بلاہت و حماقت عالم مادہ کے قائل ہیں اور ایک ایسی مقدس دُنیا پر بھروسہ کرتے ہیں جس میں شعورِ کل، احساسِ کل، حیاتِ کل، اور بصیرتِ کل موجود ہے اور جو عقلِ کل کا مقام ہونے کے ساتھ ساتھ ماورای عالمِ مادہ ہونے کے اعتبار سے اِنسان کا ہم جنس بھی ہے ... آخر کیوں تمہارے تمام اُدبی سرمائے صدای غم بلند کر رہے ہیں جبکہ تم اپنے تمام فلسفی افکار میں اس کے برعکس انسان کو اس عالم کے مساوی جانتے ہو اور دُوسری دُنیا کی نفی کرتے ہو۔

بہر حال سارتر یا اس کے ہم عقیدہ لوگ "اگزسٹینیلسٹ" ہوں یا "میٹیریلیٹ" جب کوئی شعر کہنا چاہتے ہیں، تنہائی میں سوچنا چاہتے ہیں یا اپنے آپ کو "میں" بن کر دیکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کمی کا احساس ہوتا ہے اور وہ یہاں سے بہتر یہاں سے بالاتر اور یہاں سے مقدس تر کسی اور جگہ کے وجود کو محسوس کرنے لگتے ہیں، ہم اس احساس کو پوری تاریخ بشریت میں ہر فرد کی زبان سے سنتے ہیں یہ وہ آواز ہے جو ہر گلے سے سانس کی طرح بالآخر باہر نکلتی ہے۔ غم کا یہ سایہ اِنسان کی تمام بلند پایہ ثقافتوں میں موجود ہے۔ ارسطو کے زمانے سے یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ نقاشی، موسیقی، مجسمہ سازی بلکہ آرٹ کی ہر صنف اور اُدب کے تمام سرمائے دو اقسام پر منحصر ہیں ایک میں

خوش طبعی یا مزاح کا پہلو ہے اور یہ نچلے درجے کے معمولی اور عامیانہ آثار ہیں جبکہ دُوسرے میں بلند پایہ عمدہ اِنسانی سرمایہ کی جلوہ نمائی ہے اور یہ غم انگیز آثار ہیں جنہیں "ٹریجیڈی" کہا جاتا ہے۔ یہ ٹریجیڈی بلند پایہ کیوں ہے، اس لئے کہ اس کو اِنسان کے احساس نے جنم دیا ہے۔ ایک عظیم غم اس پر طاری ہے وہ اس کمی کی حامل دُنیا کا اسیر ہے، دُوسری انجانی اور حقیقی دُنیا کی دوری کے غم نے اسے نڈھال کر دیا ہے، دراصل وہی اس کا مقام اور وہی اس کی منزل ہے۔ ہم اس اضطراب، اس دغدغہ اور کمی کے اس احساس کو تاریخ میں دو صورتوں سے دیکھتے ہیں ایک آرٹ اور دُوسرے مذہب۔ آرٹ خوبصورت، مقدس، مطلق اور بلند پایہ دُنیا کی طرف کھلنے والا دریچہ ہے اور مذہب دروازہ گویا اِنسان ہمیشہ یہ محسوس کرتا رہا ہے کہ جس کمرہ میں زندگی گزار رہا ہے وہ اس کے لائق نہیں ہے۔ یہ دُرست ہے کہ وہ کمرہ اور وہ گھر اس کی بیشتر ضرورتوں کو پُورا کر رہا ہے لیکن اس کے ذہن میں اس سے بڑی دُنیا، اس سے بڑی فضا اور اس سے بڑے آسمان کا تصور موجود ہے جو اسے وہاں کی تمنا اور یہاں رہنے کے غم میں بے چین کئے ہوئے ہے۔ غمِ فراق کے ساتھ اس بلند پایہ دُنیا کے توسل، تقرب، شناسائی اور اس گھر سے نجات کی دائمی کوشش ہر انسان کا مقصود رہا ہے خواہ وہ کسی مذہب، کسی قوم، کسی قبیلے یا ماقبل و مابعد تاریخ کے کسی دور کا اِنسان کیوں نہ ہو۔ اس سلسلے میں میرے پاس بڑے دقیق اور مکمل

شواہد و آثار موجود ہیں اور ہم اس کے اثرات کو آرٹ کی دُنیا میں دیکھتے ہیں بلکہ آرٹ دراصل یہیں سے شروع ہُوا اور احساسِ محرومی اور کمی نے اسے جنم دیا۔ آرٹ تخلیقی عمل سے عبارت ہے۔۔ اور میں اسے پیش کرتا ہوں اگر وہ تخلیقی عمل یہاں ہوتا تو اسے پیش کرنے کی ضرورت کیوں ہوتی؟ اگر در و دیوار سے ہمیں سمفونی (ایک خاص فن موسیقی) سُننے کو ملتی تو ہم کاہے کو سمفونی بناتے۔ پانی بنایا نہیں جاتا اس لئے کہ وہ موجود ہے۔ اگر خوبصورتیاں ہوتیں تو ہم اسے بنانے کی اتنی کوشش نہیں کرتے مجھے ان زیبائیوں کی ضرورت ہے جو اس عالم میں نہیں ہیں میں آرٹ کے سانچے میں انہیں عدم سے وجود میں لاتا ہوں۔ اسی طرح مجھے ایک ایسی گفتگو کی ضرورت ہے جو روزمرّہ کے معمول سے ہٹ کر ہو اس لئے کہ روزمرّہ عمل میں آنے والی گفتگو میرے تمام احساسات کی عکاسی نہیں کرسکتی لہٰذا "شعر" کے نام سے میں ایک خاص زبان کی تخلیق کرتا ہوں اور چونکہ اس عالم میں موجود تمام اشکال میری حُسن پرستی، حُسن شناسی اور حُسن طلبی کی ضرورت کو پورا نہیں کرتے لہٰذا میں اپنے محسوسات کی ان خُوبصورتیوں کو تخلیق کرتا ہوں جو میری ضرورت ہیں اور اس عالم میں نہیں ہیں۔ اس بنا پر آرٹ اس دریچے سے عبارت ہے جو اس نامعلوم عالم کی طرف کُھلتی ہے جس میں ہماری تمام خواہشات مضمر ہیں اور وہ اس اِنسان کے محقر گھر میں نصب ہے جہاں وہ بصورت قیدی رہتا ہے۔ آرٹ کی کوئی عمیق فلسفی بُنیاد نہیں ہے بلکہ وہ خالصتاً محسوسات

پر مبنی ہے۔ میں اس میں گرفتار ہوں۔ یہ گھر خوبصورتیوں سے خالی ہے۔۔۔(۱) اس میں ضروری زیبائشوں کی کمی ہے میں اپنے گھر کے دریچے کو اس عالم کی طرف کھولتا ہوں جو یہاں سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ بلند و بالا ہے۔ لیکن مذہب خاکی اور مادّی گھر کے اس دروازے کو کھولتا ہے جہاں سے وہ اِنسان کو باہر نکال کر اس راستے تک لے جائے جس کا نام مذہب ہے اور جو خدا تک پہنچتا ہے۔ لہٰذا مذہب اس معقول نجات سے عبارت ہے جو مجھے اس مکان سے باہر لاتی ہے جہاں میں احساسِ بیگانگی کا شکار ہوں۔ اور آرٹ عبارت ہے اس جھوٹی سیری کا جس کی مجھے طلب ہے اور یہ دُنیا اس سے خالی ہے۔

اِنسان ہمیشہ اپنے آپ کو اس عالم میں پابندِ سلاسل محسوس کرتا رہا ہے جس میں اِنسانیت کا جوہر جتنا زیادہ ہوگا اس میں اسی قدر یہ احساس شدید تر ہوگا اور اس کی دلیل یہی ہے جسے میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ ارسطو سے لے کر اب تک "ٹریجیڈی" یا آرٹ اور ادب کے غم انگیز سرمایوں کو بلند پایہ آثار قرار دیا جاتا ہے۔ روزمرّہ کے معمولی اور پست دُنیاوی مسائل کے حل، ہمیں اتنی خوشی اور مسرّت فراہم کرتے ہیں کہ ہم آپے سے باہر ہوجاتے ہیں اور اُچھلنے کودنے اور چٹکی بجانے لگتے ہیں۔ یہ صورت اِنتہائی معمولی اور نہایت حقیر احساس سے ہم پر رونما ہوتی ہے لیکن گہرا اور عمیق احساس، ہم میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی غم

---

(۱) ٹیپ ناقابلِ فہم ہے۔

شامل حال ہو جائے۔ غم انسان کو ایک نہایت گہرے اور مؤثر احساس میں مبتلا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ٹریجیڈی کو بلند پایہ آثار کا درجہ حاصل ہے اور اسی وجہ سے ہمیں غم عزیز ہے۔ انسانیت کی منزل پر جس کا رتبہ جتنا بلند ہوگا اسے غم انگیز آثار سے اتنی ہی محبت ہوگی۔ آخر کیوں؟ ... اگر ہم تمام فلموں کو ... (۱) تمام شعری مجموعوں کو ایک جگہ رکھ کر پستی اور بلندی کے اعتبار سے اس کی تقسیم کریں تو بلند پایہ آثار کی فہرست میں ہمیں صرف وہی مواد ہاتھ آئے گا اور وہی سرمایہ سامنے آئے گا جو غم انگیز ہوگا اور تمام پست اور نچلی سطح کے آثار نشاط انگیز ہوں گے اور یہ بات بلا استثناء ہمیشہ اور ہر دور میں رہی ہے۔ آخر کیوں غم انگیز اشعار ہمیں اچھے لگتے ہیں؟ کیوں بلند پایہ لوگ پُر مسرت تصنیفات کا مطالعہ نہیں کرتے؟ اور بیشتر اندوہ گیں شعری مجموعے ان کے مطالعہ کا محور بنتے ہیں؟ ... تمام یورپ میں اس بات کا محاسبہ ہوا ہے کہ کامیڈی فلموں کو زیادہ تر وہی لوگ دیکھتے ہیں جو کلچر کے اعتبار سے نچلی سطح پر ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس ٹریجیڈی فلمیں نجباء اور وہ لوگ پسند کرتے ہیں جو اعلیٰ ثقافتی رجحان رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب ان فلموں کو بیرون ملک بھیجا جاتا ہے تو کامیڈی سے متعلق فلمیں ان ممالک کو بھیجی جاتی ہیں جو کلچر کے اعتبار سے نچلی سطح پر ہوتی ہیں لیکن وہ ممالک جو اونچی ثقافت اور اونچے تمدن کے حامل ہوتے ہیں انہیں غم انگیز فلمیں برآمد کی جاتی ہیں۔

---

(۱) یہاں بھی ٹیپ ناقابل فہم ہے۔

ہمیں موسم خزاں کیوں اچھا لگتا ہے اس لئے کہ ہم وہاں "انجام" کو محسوس کرتے ہیں ... ہمیں احساسِ انجام ہونے لگتا ہے ... یعنی ہم نجات کے دائمی درد کو عالم غروب میں زیادہ مؤثر طریقہ پر محسوس کرتے ہیں اور اس غروب کو زیادہ تر اپنے سے ہم تعلق پاتے ہیں۔ انسان اپنی ہر شکل میں اس کیفیت سے دوچار رہا ہے وہ اپنے آپ کو اس زندان میں اسیر محسوس کرتا رہا ہے اور اس دردِ اسیری کو اپنے سے کم کرنے کے لئے زندان کی کوٹھڑی کو اپنے گھر کے انداز پر سجاتا ہے۔ میرا اشارہ آرٹ کی سمت ہے۔ گویا آرٹ سے وہ اس کمی کو پورا کرنا چاہتا ہے جو اس کے لئے چبھن بنی ہوئی ہے۔ کبھی زندان سے نجات حاصل کرنے اور اپنے وطن اور اپنے گھر جانے کے لئے وہ دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا ہے یہی کوشش اور باہر نکلنے کی یہی تلاش مذہب ہے۔ اسی لئے مذہب اور آرٹ ایک مشترک احساس اور مشترک فطرت کی پیداوار ہیں اور یہی وجہ ہے کہ پوری تاریخ میں ہمیشہ بلا استثناء ہر آرٹ مذہب کی آغوش میں رہا ہے۔ اور یہ میں نہیں تاریخ علم اور تاریخ آرٹ کہتی ہے اور اسے سب سے پہلے "دورکھیم" نے پیش کیا اور بتایا کہ کس طرح بلا استثناء ہر آرٹ مذہب کا حصہ رہا ہے یہاں تک کہ ڈیکوریشن یعنی گھروں کی سجاوٹ بھی مذہب سے متعلق ہے اور اس وقت سے ہے جب انسان نے ابھی گھر بھی بنانا نہیں سیکھا تھا ... اس کا کوئی گھر نہیں تھا، وہ صحرا نورد تھا اور غاروں میں بسیرا کرتا تھا اور انہیں غاروں میں خوشنما محرابیں بناتا تھا اسے رنگ کرتا تھا اور اسے

خوبصورتی بخشتا تھا۔ ۔ ۔ اس بنا پر معماری اور سجاوٹ کا فن مذہبی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے مذہب کے واسطے سے اس وقت وجود میں آیا جب انسان نے ابھی اپنے لئے گھر بھی نہیں بنایا تھا کیونکہ آرٹ، انسان اور مذہب آپس میں ہم تعلق ہیں۔ آرٹ انسان کے درد والم کے کرب کو دور کرنے کے لئے اسے فریب آمیز جواب دیتا ہے، اس زندان کو اس کے لئے حقیقی گھر کی مثال بناتا ہے اور مذہب وہ تلاش اور وہ کوشش ہے جو انسان کو اس زندان سے چھٹکارا دلاتا ہے۔ پوری تاریخ بشر میں مذہب سے ہٹ کر جس میں میں نے عرض کیا تھا کہ وہ حصول نجات کے لئے درِ زندان کو کھولنے سے متعلق ہے اور اس منزل کی طرف لے جاتا ہے جس نے ہمیشہ اسے آگاہ یا ناآگاہ طور پر اذیت دی ہے۔ اس سے ہٹ کر انسان اپنی آرزوؤں کو پانے اور اس کمی کے ازالہ کے لئے جسے وہ اس دنیا میں محسوس کرتا ہے تخلیق سے ہمکنار ہوا۔ کچھ نہیں تو ذہنی تخلیق سہی۔ سفرِ آخرت کا دھیان اور احساسِ کمی وہ تجلیات ہیں جنھوں نے انسان کو منتہائے مقصود کی صورت کشی پر ابھارا۔ منتہائے مقصود کیا ہے وہ اس سے بے خبر تھا۔ ابھی وہ اتنا تعلیم یافتہ نہیں تھا کہ اپنے منتہائے مقصود اس کی جگہ اور تصویر کو صحیح اور مکمل طور پر سمجھ سکے لیکن یہ تصور کہ وہ یہاں کے لئے نہیں ہے اس کی ضرورتیں اتنی بلند پایہ ہیں کہ یہ دنیا اس کی تکمیل سے عاجز ہے۔ ہمیشہ اس کے ذہن کو اس کے فکر کو اس بات پر ابھارتا رہا کہ وہ اپنے فرضی منتہائے مقصود کو ذہن کے پردوں پر مرتب کرے۔ اس

کے لئے اس نے داستان سازی سے کام لیا جو ابتدائی تاریخ سے آج تک موجود ہے۔ وہ اپنے داستانوں میں ایسے افراد، ایسے حوادث اور ایسے رابطوں کو کیوں پیش کرتا ہے جو اس عالم میں نہ صرف موجود نہیں بلکہ ناممکن بھی ہیں۔ ۔ ۔ اس لئے کہ جس چیز نے اسے بوڑھا کر دیا ہے اور جس کی تلاش اور آرزو میں وہ مضطرب اور بے چین رہا ہے وہ "مطلق" ہے۔ مطلق کیا ہے؟ خوبصورت ترین خوبصورتی، پر جلال ترین جلال، عظیم ترین عظمت، خلود، دائمی حیات اور ہمیشگی۔ ۔ ۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کے لئے انسان ہمیشہ بے چین رہا ہے۔ ۔ ۔ بالکل بے کھوٹ اور مطلق پاک عشق، حدِ اعلیٰ پر واقع محبت و جاں نثاری ناقابلِ شکست مطلق صاحبِ قوت اور وہ مطلق پارسائی جو کبھی کسی پلیدی یا جھول کا شکار نہ ہو سکے، یہ اور ان جیسے مطلق، کامل اور حدِ اعلیٰ سے متصل صفات، کامل ترین کامل مطلق انسان ہمیشہ وہ مفاہیم لے رہے ہیں جن کی بشر کو مستقل تلاش رہی ہے اور جس کے لئے وہ بے چین رہا ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جنہیں وہ اپنا ہم جنس سمجھتا ہے اور ان ہی مطلق صفات کی آرزو اس کا منتہائے مقصود ہے۔ ۔ ۔ یہاں جو چیز اسے ملی آلودہ ملی، اگر عشق تھا تو پلیدی سے ملوث تھا۔ اسے اس عشق کی ضرورت تھی جو کسی ناپاکی، کھوٹ، ہوس اور برائی سے آلودہ نہ ہو۔ اس نے داستان مرتب کی اور اس میں یہ بات رکھی کہ وہ عشق جس کی اسے آرزو ہے اور جس کو حقیقتاً ہونا چاہیے وہ یہاں مفقود ہے اور ڈھونڈے نہیں ملتی۔ پھر اسی رَہ پر چلتے ہوئے وہ ایک ایسے عالم کا خاکہ تیار کرتا ہے جو اس کا

آئیڈیل ہے۔ گویا بہترین افراد کا بہترین شہر جسے "یوتوپیا" (UTOPIA) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ خیالی شہر افلاطون سے آج تک چلا آ رہا ہے۔ ذہن ایک ایسے شہر کی تخلیق کرتا ہے جس کا وجود روئے ارض پر ممکن اور میسّر نہیں۔ اسی طرح ہمیشہ خیالی شہروں کی تعمیر ہوتی رہی ہے۔ تمام ثقافتوں میں "جنّت" کا وجود رہا ہے۔ جنّت ایک ایسی مطلق اور آئیڈیل زندگی سے عبارت ہے جو حقیقی روپ کے ساتھ کسی کلچر میں موجود نہیں۔ یہ دراصل انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔ عقیدۂ جنّت اور عقیدۂ مدینۂ فاضلہ انسان کی فطرت میں شامل ہے البتہ اس کی کیفیت اور نوعیت کا تعلق انسان کے کلچر اس کی معنویت اور اس کے کمال کی میزان پر ہے۔ بہشت کی شکلیں مختلف رہی ہیں لیکن اس میں کسی کو پس و پیش نہیں کہ اس زندگی سے ارفع و اعلیٰ کوئی اور زندگی بھی ہے جو اس کی ہم جنس اور ہم نفس ہے۔

انسان کے احساس اور اس کی رُوح میں بسا ہوا عظیم پیکر وجود، دیومالائی ہے جو عظیم ہستیوں، اعلیٰ بود و باش، بلند پایہ مظاہر، احساسات، تعلّقات اور انسانی روابط کا ایک مطلق مگر فرضی نمونہ ہے۔ مگر چونکہ یہ دیومالائی یا فرضی تخیّل اسے اس زمین پر دستیاب نہیں تھا اس لئے اس نے اپنے ذہن ہی میں ان مظاہر، تماثیل اور دیوتاؤں کی صُورت گری کی اور بعد میں انہیں پوجنا بھی شروع کر دیا اور یوں اسے اپنی تسکین کا سامان فراہم ہو گیا۔

آج شب کی اس بحث میں، میں جس نتیجہ پر پہنچنا چاہتا تھا اسے نہایت معذرت کے ساتھ مجبوراً مجھے کل شب کی بحث کے لئے چھوڑنا ہو گا۔ ۔ ۔ مختصراً عرض ہے کہ یہ واردات کسی خاص مذہب کسی خاص ثقافت یا کسی خاص تمدّن کی پیداوار نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق انسان سے ہے جس نے ہمیشہ اس عالم میں ایک گونہ کمی اور بیکسی کا احساس کیا ہے۔ اس کمی اور بیکسی کے احساس نے اس غم و الم اور اضطراب کو پیدا کیا اور پھر اسی احساس نے اس کے ذہن میں وطن اور عالم غیب کی تمنا کو بیدار کیا وہ عالم غیب جو اس کے رہنے کا اصل مقام ہے لیکن وہ اس کے محل وقوع اور کیفیت سے ناواقف ہے۔ تاہم اسے اتنا علم ہے کہ وہ یہاں کا نہیں ہے۔ ۔ ۔ اس دائمی اضطراب نے اس عالم میں احساس کمی کی تلافی کے لئے آرٹ کو پیدا کیا اور مذہب نے وہ راہ دکھائی جو انسان کو دکھ، درد اضطراب اور غریب الوطنی کے احساس سے نجات دلاتی ہے۔ انسان پوری تاریخ میں ہمیشہ غم و الم کا شکار رہا۔ یہ دُنیا ہمیشہ اسے پست اور کمتر نظر آئی خواہ وہ سارتر کی طرح خدا کا معتقد نہ ہو لیکن ناچار یہ مانتا ہے کہ انسان اس دُنیا سے بالاتر ہے، وہ مطلق پسند اور مطلق پرست ہے اور ہر اعتبار سے مطلوب مطلق کے مظاہر کمالات کا خواہاں ہے اور ہر آرٹ، ہر ادب، ہر پینٹنگ، ہر ثقافت اور ہر مذہب اس کے اس احساس کی پوری عکاسی کرتا ہے اور تمام تاریخ بشر اس پر گواہ ہے۔ انسان کے اس احساس کی ایک پوری جھلک ہمیں دیومالائی قصّوں کی صورت میں نظر آتی

ہے جنھوں نے اس بیکس انسان کو ان ماورائی مفہوم کے حامل دیوی دیوتاؤں کی پرستش پر وادار کیا جس کا وجود اس عالم میں نہیں ملتا اور جس کے لئے وہ بے چین اور سرگرداں ہے اور اپنی تلخیٔ حیات کو اس کے ذریعے کم کرنا چاہتا ہے۔ دیومالائی دُنیا کی تشکیل اس کے درد و الم اور مضطرب رُوح کی دوا ہے۔

اگلی رات کی تقریر میں، مَیں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ کس طرح ہر مذہب ... مُعاف کیجئے گا ہر ثقافت، دُنیا کی تمام نسلیں، تاریخ کے ہر دور کا انسان، "گیلگمش" سے "سارتر" تک، ماقبل تاریخ کے بدوی انسان سے آج کی متمدن یورپی دُنیا تک سب دیومالائی صورتیں تراشنے میں مشغول ہیں اور ان دیومالائی مظاہر نے انسان کی معنوی حیات میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ اور اس داستان میں "علیؑ" کون ہے اور کیا ہے؟

دوسری شب

۷ مارچ ۱۹۶۸ء

ممکن ہے کل شب کی تقریر میں کچھ خواتین و حضرات موجود نہ ہوں اور پھر جن مسائل کو آج میں پیش کرتا ہوں ان کا انطباق میری پچھلی تقریر پر ہے لہٰذا میں ضرورتاً اسے فہرست وار دہرانا چاہتا ہوں تاکہ اپنی بحث کے سلسلے کو آگے بڑھا سکوں۔

موضوعِ بحث جیسا کہ اعلان کیا جا چکا ہے "علیؑ دیومالائی داستانوں کی ایک سچی حقیقت" سے عبارت ہے ... ایک دیومالائی سچ ... کل رات میں عرض کر چکا ہوں کہ ہر محقق کو یہ حق حاصل ہے کہ علیؑ کو اپنے زاویۂ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کرے، علیؑ کو سمجھنے کا ایک زاویۂ نگاہ تشیع ہے اور یہ وہ مذہب ہے جس کے مظہر "علیؑ" ہیں۔ یا پھر آپ کو اسلام اور تمام اسلامی فرقوں کی مشترکہ تاریخ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے جہاں آپ کی ذات ان بلند پایہ ابتدائی ہستیوں میں شامل ہے جو اسلام کی رُوحِ رواں ہیں۔ علیؑ کو اس محقق کی نگاہ سے بھی دیکھا جا سکتا ہے جو تاریخی شخصیت کے عنوان سے تاریخ اسلام میں آپ کے کردار کا جائزہ لے رہا ہے اور اس منزل پر ہے جو نوعِ بشر کے حساس ترین اور اہم ترین ادوار میں شامل ہوتا ہے۔ چودہ سو سال پہلے جب تاریخِ اسلام بشریت کے ایک عظیم موڑ پر پہنچ چکا تھا علیؑ نے کتنے عمیق اور کتنے عظیم کردار کا مظاہرہ کیا۔ ممکن ہے مؤرخ

آپ کو تاریخی شخصیت اور بعد کی تاریخ پر مُرتب ہونے والے اثرات کے اعتبار سے محلِ مطالعہ قرار دے لیکن میں نے ان میں سے کسی نقطۂ نگاہ کو اپنے لیے اِنتخاب نہیں کیا ہے بلکہ اِنسان شناسی اور انسان کے وہ ذاتی خصائل وخصوصیات میرا مطمحِ نظر ہے جسے تاریخ نے اپنے سینے میں سما رکھا ہے اور جسے اہلِ یورپ نے "انسانی طبیعت" یا انسان کی کلی حقیقت یا تمام اِنسانوں میں مُشترک اِنسانیت کا نام دیا ہے۔

ان خصوصیات، ان احتیاجات اور ذاتی طور پر اِنسان کی طبیعت میں سمائے ہوئے ان خصائل کے روبرو علیؑ کی شخصیت کو پرکھنے کی ضرورت ہے، اور میری یہ کوشش ہوگی کہ میں اپنی بساط کے مُطابق اس مسئلہ کو پیش کروں اور یہ واضح کروں کہ اِنسانیت میں علیؑ کی شخصیت کس مقام و منزلت کی حامل ہے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں میری بحث دو باتوں کی شناخت پر منحصر ہے۔ ایک اِنسان اور دوسرے علیؑ، اور دونوں کی شناخت مشکل ہے۔ گزشتہ شب میں عرض کر چکا ہوں کہ اِنسان کس طرح "مجہول" ہے۔ اور جس طرح اِنسان تاریخ سائنس میں مجہول ہے اسی طرح علیؑ بھی اپنے پیروکاروں کے درمیان مجہول ہیں۔ باوجود اس کے کہ اِنسان نے فطرت کی شناخت میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اور کائنات میں چھپی ہوئی مادّی اور معنوی چیزوں کو بَرملا کیا ہے ابھی تک اِنسان اور حیات، ... خاص طور پر اِنسان، سائنس کا مجہول ترین مسئلہ رہا ہے اور

میں جان ڈیوئی کے حوالے سے عرض کر چکا ہوں کہ پوری تاریخ میں انسان کبھی اتنا مجہول نہیں تھا جتنا ان پچھلی تین صدیوں میں ہے جو سائنس کے ادوار کہلاتے ہیں۔ "الیکسیس کارل" فرانس۔ یورپ۔ اور امریکا کی شمولیت کے ساتھ علم الانسان کا ایک عالمی مرکز قائم کرتا ہے جہاں فزیالوجی، نفسیات، علومِ قلب و دماغ، عمرانیات اجتماعی نفسیات اور نسل شناسی سے متعلق تمام دانشوروں کے تحقیقاتی مجموعوں کو اپنی سرپرستی میں جمع کرتا ہے اور پھر خود ہی ان تحقیقاتی مجموعوں کو جو انسان کے بارے میں آج کے تمام اِنسانی علوم کا نچوڑ ہیں زیرِ مطالعہ قرار دے کر انہیں ایک کتاب میں یکجا کرتا ہے اور اس کا نام "انسان۔ ایک مجہول ہستی" قرار دیتا ہے یعنی اِنسانی شناخت سے متعلق عالمی مرکز اور اس واحد شخصیت کی طرف سے جو اس کا سرپرستِ اعلیٰ ہے اور انسان شناسی اس کا مطمحِ نظر ہے یہ اعلان ہوتا ہے کہ اِنسان آج کے اعلیٰ ترین علوم اور آج کے ترقی یافتہ اِنسان کے مقابل بھی ایک مجہول ہستی ہے اور یہ بات اس مرکز سے آرہی ہے جس کا شمار اِنسان شناسی کے عنوان سے یورپ کے جدید ترین علوم میں ہوتا ہے اور جس کا پہلا موسس "کارل" ہے۔ اس بنا پر انسان کی شناخت اور اس پیچیدہ لفظ کے مفہوم پر منحصر علیؑ کی شناخت اِنتہائی دشوار مسئلہ ہے۔

پچھلی تقریر میں، میں عرض کر چکا ہوں کہ مختلف ثقافتوں کی تاریخ، مختلف تمدن، تاریخ ادب، تاریخ آرٹ، تاریخ مذہب، تاریخ فلسفہ نے

زمین پر انسان کی سرگزشت کے آغازِ طلوع سے اب تک جن آثار کو پیش کیا ہے اور جن میں شک کی کوئی گنجائش نہیں اور میرے بیان کردہ تمام مسائل و واقعات بھی جن کی تائید کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان ایک ایسی ہستی ہے جو آغازِ تاریخ سے ہر وقت اپنی اور دنیا کی حقیقت کے بارے میں سوچتا رہا۔ روزمرہ کے مشاغل سے فرصت پانے پر ایک بے چینی اس پر طاری ہوتی اور وہ ایک مبہم غم میں مبتلا رہتا اور ہر چیز میں اسے کمی اور نقص کا احساس ہوتا . . . حتیٰ کہ بدوی انسان بھی اس احساس سے دچار تھا۔ انسان جتنا آگے بڑھتا گیا یہ احساس اس میں زیادہ ہوتا گیا یہ دنیا اسے محرومی کا شکار نظر آئی اور اس شے کے احساس و طلب میں شدت پیدا ہوئی جس سے یہ دنیا خالی ہے۔ نتیجتاً اس کے اضطراب اور قنوطیت میں اضافہ ہو گیا۔ اس نے دنیا کی ہر چیز کو فانی پایا۔ یہاں کوئی ہستی مستقل نہیں تھی۔ ہر آنے والا، جانے والا تھا اسی لئے اس نے یہ محسوس کیا کہ اس کا تعلق اس دنیا سے نہیں ہے۔ یہ دنیا اور اس سے متعلق چیزیں اس کا مقصدِ حیات نہیں ہیں وہ اس عالم کی جنس نہیں ہے بلکہ محسوس مادہ سے بالاتر کسی اور فطرت سے اس کا تعلق ہے۔ بے چینی، اضطراب اور کمی کے تصور نے اسے اسیری اور بیکسی کے احساس میں مبتلا کر دیا اور اس احساس نے اس میں وطن کی فکر پیدا کی اور وہ سوچنے لگا کہ شاید کوئی اور مقام ہے جس سے اس کی وابستگی ہے۔ شاید کوئی ایسی جگہ ہے جس میں ہر شئے مکمل ہے۔ شاید ایسا کوئی مقام ہے جہاں اسے وہ چیز میسّر ہو

جس کے لئے وہ یہاں سرگرداں ہے اور ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ اس احساس نے فطری طور پر اسے بہتر، برتر اور کامل تر دنیا کی طرف متوجہ کیا اس دنیا کی طرف جس میں ہماری ضرورت اور خواہش کی ہر چیز موجود ہے، جہاں ہر وہ چیز دستیاب ہے جو اس دنیا میں ڈھونڈے نہیں ملتی۔ جہاں ہر چیز، ہر شئے انسان کی ہم جنس ہے اور یہی وجہ ہے کہ پوری تاریخ اور تمام بدوی ثقافتوں میں وہ پہلا خاکہ جو انسان کے ذہن میں نمودار ہوا "عالم اعلیٰ" سے متعلق تھا اس نے عالم اعلیٰ اور عالم اسفل پر دنیا کی تقسیم کی۔ کوئی ثقافت ایسی نہیں جس میں دنیا کی دوگانگی کا یہ تصور موجود نہ ہو۔ عالم پست اور عالم ناقص کے ساتھ مطلق، کامل، انسان کی متجانس، مقدس، اچھی اور خوبصورت دنیا کا تصور اصولاً ہر ثقافت، ہر مذہب اور ہر فلسفے میں مشترک رہا ہے۔

پھر میں اپنی پچھلی تقریر میں یہاں تک پہنچا کہ انسان اپنی ضرورت کی محسوس کمی کو پورا کرنے اور زندگی کی اسیری سے متعلق اپنے تلخ احساس میں کمی کے لئے مختلف کوششیں کرتا رہا۔ تاریخ میں انسان کے چہرے پر یہ کرب بڑے واضح طور پر نمایاں ہے۔ خاص طور پر بورژوائی اور طبقاتی نفسیات میں، میں نے مثالیں فراہم کیں اور بتایا کہ فرد ہو یا اجتماعی طبقہ، جس قدر جو زندگی کی نعمتوں سے زیادہ بہرہ مند ہو گا عالم بالا کی شناخت، اس کے حصول، اس کی خوبصورتیوں اور آسمانی مائدہ تک پہنچنے کا اضطراب و دغدغہ اس میں اسی قدر زیادہ ہو گا اور یہی وجہ ہے کہ آج عمرانیات کے اعتبار سے دنیا کی نسبت سے دل برداشتگی اور قنوطیت امراء اور مرفہ الحال طبقہ کا خاصہ ہے

دراں حالیکہ پرولتاری نفسیات یہ ظاہر کرتی ہے کہ غیر سرمایہ دار طبقہ صرف ان چیزوں کے بارے میں سوچتا ہے جو محسوس و موجود ہوں۔ ان کی ضرورتیں، ان کی آرزوئیں روٹی، کپڑا، مکان، اچھی نگہداشت اور دولت و ثروت ہے لیکن جنھیں یہ سب چیزیں میسّر ہیں انہیں ان چیزوں کی ضرورت ہے جو اس عالم میں نہیں ہیں اور یہ غم ہمیشہ ان کے ساتھ پیرِ تسمہ پا کی طرح رہتا ہے۔ یہ دُنیا ان کے آرزوؤں کی تکمیل سے عاری ہے اور اس طرح کے تلخ احساس سے دُچار انسان جسے بیکسی کے احساس نے دبوچ رکھا ہے اور یہ غم اسے کھا رہا ہے کہ وہ ایک ایسے ماحول میں آگیا ہے جو اس سے موانست و تجانست نہیں رکھتا ہمیشہ اس مُصیبت سے چھٹکارے کی تلاش میں رہتا ہے اور یہ تلاش پوری تاریخ بشر میں ایک لمحے کے لئے بھی اس سے ساقط نہیں ہُوا اور اس تلاش کا مقصد انسان کی نجات ہے۔ اور یہ لفظ نجات جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں تمام قدیم مذاہب اور فلسفوں کی روح رواں رہا ہے اور اس امر کی نمائندگی کرتا ہے کہ انسان پہلے سے یہ محسوس کرتا رہا ہے کہ اسے اپنی موجودہ کیفیت سے بلند تر ہونا ہے، نجات حاصل کرنا اور زیادہ بہتر تک پہنچنا ہے۔ اور اسی لئے وہ ہمیشہ اس نجات اور فلاح کی کھوج میں رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آریائی، چینی اور ہندوستانی فلسفہ کی رُوح "مکتی" ہے یعنی اس عالم مطلق کی طرف جانا ہے جو "نروان" ہے۔ اس پست، ناپائیدار، پلید اور دُکھ بھری دُنیا "سنسار" سے نجات حاصل کر کے ایسی دُنیا کا حصول ہے جو مطلق، پُرسکون اور "نروان" ہے۔

اور جہاں انسان کی رُوح اپنی تمام ضرورتوں کے ساتھ سیراب ہو گی اور پوری تاریخ ہند میں یہی ویدا اور بدھ فلسفہ کی بُنیاد ہے۔ اسی طرح ایتھنز اور اس کی ثقافت میں بھی ہمیں یہ جستجو اور تلاش مسلسل دکھائی دیتی ہے جہاں انسان دیوتاؤں کی دُنیا کے حصول کے در پے ہے۔ ایتھنز کے ہر رہنے والے کی یہ تمنا تھی کہ وہ اپنے آپ کو اس زمین سے "مونپیرنس" کی اس چوٹی تک پہنچا دے جو عظیم دیوتا "زئوس" کا مقام ہے اور جہاں وہ اپنی ان ۹ لڑکیوں کے ساتھ رہتا ہے جو مختلف خوبصورتیوں کی مالک ہیں۔ وہ جگہ کونسی ہے؟ اہل یونان کے مُطابق یہ وہ مقام ہے جو انسان کے شایانِ شان ہے لیکن عالم خاک پر اس کا وجود پایا نہیں جاتا لہٰذا اس خاک سے چھٹکارا حاصل کر کے ہمیں "مونپیرنس" کی اس چوٹی تک پہنچنا ہے جو مطلق اچھائیوں اور مطلق خوبصورتیوں کی آماجگاہ ہے۔ آدم سے شروع ہو کر خاتم پر ختم ہونے والے مذاہب میں بھی جس کی آخری اور مکمل ترین کڑی ہم اور ہمارا اسلام ہے ہم دیکھتے ہیں کہ "فلاح" اللہ کی طرف رُجعت اور اس مادّی دُنیا سے نجات وہ وہ بُنیادی مسائل ہیں جو اس مذہب کی اساس ہیں۔ اس بنا پر اور ویدی ثقافت کی رو سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ آج سے آٹھ ہزار، دس ہزار، بیس ہزار یہاں تک کہ اسپین میں تازہ ترین دریافت ہونے والے غار میں رہنے والا ۳۳ ہزار سال پہلے کا انسان اور نیز وہ لوگ بھی جو آج کے دَور میں بغیر لباس اور بغیر کسی مُعیّن راہ عمل

کے بدوی زندگی کی آغوش میں پل رہے ہیں سب کے سب اس "غیب" کی تلاش میں ہیں اور اس تک پہنچنے اور اسے حاصل کرنے کی جستجو ان کا مقصدِ حیات بنا ہوا ہے، انہیں یہاں سے بہتر کی تلاش ہے۔ وہ اس مقام کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جو انسان کے شایانِ شان ہے اور جس کا حصول اس کے بلئے ضروری ہے۔ یہ دُنیا محرومیوں کا شکار ہے اور وہاں سَب کچھ ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمام مذاہب میں "جنّت" کا تصور ہمیشہ ذہنِ انسانی کا سرمایہ رہا ہے۔ حتیٰ کہ غیر مذہبی فلسفیوں نے بھی مدینۂ فاضلہ کو پیش کیا ہے۔ اور اس طرح "یوتوپیا"۔ افلاطون۔ "خدائی شہر" تھامس مور اور "سن سٹی" زان ایزولہ کا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے جنّت اور ماوراء الطبیعہ کو یا قابلِ ذکر نہیں جانا یا سرے سے انکار کیا۔ لیکن اس کے باوجود پھر بھی دائمی ضرورت، دائمی اضطراب اور دُنیا میں گھٹن کے احساس نے انہیں اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ ایک تصوراتی، فرضی، خوبصورت اور مطلق دُنیا کی تخلیق کریں اور ایک مدینۂ فاضلہ، ایک خدائی شہر یا پھر زان ایزولہ کے مقدس شہر کو اپنے ذہن میں تعمیر کریں۔

اِنسان کی لگاتار انتھک کوششوں میں مذہب بھی حصولِ مُراد کا ایک ذریعہ ہے اور اس غربت کدہ میں گھٹن کے شکار انسان کی ضرورتوں کا جواب ہے اور میں عرض کر چکا ہوں کہ مذہب اس چھوٹے حقیر سرائے سے انسان کی نجات کے لئے دروازہ کو کھولتا ہے جو اسے اس پاک مقدس اور کشادہ مکان کی طرف لے جاتا ہے جس کا وہ ہمیشہ آرزومند رہا ہے۔۔

اور آرٹ اور اس کی مختلف قسمیں بھی اس انسان کی جستجو ہیں جو اپنے آپ کو اسیر اور جینے پر مجبور پاتا ہے جسے یہ دُنیا بدصورت اور محرومی کا شکار نظر آتی ہے۔ اسے زیادہ خوبصورتیوں، زیادہ اچھائیوں اور زیادہ بلندیوں کی ضرورت تھی جو اس دُنیا میں اس کے لئے میسّر نہیں تھی اسی لئے اس نے تخلیق کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ایسی چیزیں خلق کیں جو اس دُنیا میں نہیں تھیں آرٹ، شعر، موسیقی، نقاشی، مختلف النوع تصویریں سبھی کچھ اس نے اپنے لئے پیدا کیا۔ اس بنا پر یہ تمام فنونِ لطیف خوبصورتیوں اور اچھائیوں کی اس تخلیق سے عبارت ہے جسے انسان نے چاہا اور یہ دُنیا اسے دے نہ سکی۔ یہی وجہ ہے کہ آرٹ کی طرف ہاتھ بڑھانے والا انسان اپنی تخلیق کے ذریعے اس کمی اور محرومی کو دُور کرتا ہے جو اس کے وجود میں سمایا ہوا ہے۔ اَب اس تخلیق کی اچھائی اور اعلیٰ پایگی کا انحصار اس کی استعداد پر ہے۔ اگر وہ اس میں خوبصورتی پیدا نہیں کر سکا تو یہ یا تو اس کی فنی صلاحیتوں کی کمی ہوگی یا پھر سوچ کا وہ پیمانہ ہوگا جس سے آگے بڑھنا اس کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ لیکن بہرحال جو بھی ہے آرٹ کے میدان میں قدم رکھنے والا ہر شخص ایک ایسی اچھائی اور ایسی خوبصورتی کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے جو اس دُنیا میں اس کے لئے میسر نہیں اور جس کی تکمیل اس کے لئے ضروری ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا تعلق بھی اسی احتیاج سے ہے جس نے مذہب کے احساس کو انسان میں اُجاگر کیا۔ تاہم جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ

ایک دریچہ ہے جو دوسرے عالم کی طرف کھلتا ہے وہ عالم جس کا وجود ضروری ہے مگر یہاں مفقود الاثر ہے، وہ چیزیں جن کا یہاں ہونا لازم ہے مگر دستیاب نہیں۔ یہ وہ دریچہ ہے جو کم از کم ہمارے اس احساس میں کمی پیدا کرتا ہے کہ ہم یہاں کے اسیر ہیں اور اس گھر میں ہیں جو ایک نظر ہیں نہیں بھاتا مگر مستقل طور پر ہماری نظریں اسے دیکھتی ہیں۔ ہم اس گھر کو آرٹ کی سجاوٹ سے ایسے گھر سے بدل دیتے ہیں جو ہمارا مقصود نظر ہے اور ان اچھائیوں اور خوبصورتیوں کا حامل ہے جو یہاں نہیں ملتیں۔ یہی وجہ ہے کہ آرٹ کا سب سے بڑا ابلاغ یہ ہے کہ وہ اس عالم میں انسان کی بیکسی کے احساس کو کم کرتا ہے اور اپنی زیبائش سے اس بدصورتی کو دور کرتا ہے جو اس دنیا سے متعلق ہے جس میں وہ جی رہا ہے، اور اس فضا کی تکمیل کرتا ہے جس میں وہ جینے پر مجبور ہے یہاں اس بات کا موقع نہیں کہ میں آرٹ سے متعلق اقوال، اس کی تاریخ اور قسموں پر گفتگو کروں اور یہ بتاؤں کہ کس طرح یہ قسمیں انسان کی محرومیت کی نمائندگی کرتی ہیں اور اس احساس کو پیش کرتی ہیں جسے انسان چاہتا ہے مگر یہاں اسے نہیں ملتی . . .

وہ عمل جو ہمیشہ انسان سے وابستہ رہا اور آج بھی ترقی یافتہ مادی انسان کا وطیرہ ہے اور جسے میٹافزکس دشمن فلسوف اور منطقی انسان نے بھی اپنایا، ان نمونوں ان زیبائشوں اور اس دنیا کی تراش ہے جسے ہونا چاہیے اور نہیں ہے۔ آخر کیونکر یہ عمل انجام پائے؟ کچھ نہیں تو

تصور ہی میں اس نے ایک تخیلی دنیا کی تعمیر کی۔ اس عالم میں کمی اور محرومی کے احساس کی تکمیل کے لئے ایک راہ جو اس نے تلاش کی وہ دیومالائی قصوں سے متعلق تھی، دیومالائی قصوں کی دو قسمیں ہیں یا کوئی حقیقی تاریخی شخصیت پیش نظر ہے، کوئی بہادر، کوئی زورمند جس نے ۳۰، ۵۰ یا ۶۰ سال زندگی کے دن گزارے اور کامیابیاں بھی اس سے وابستہ رہیں اور پھر بیمار ہوا اور مر گیا یا مار دیا گیا اور بعد میں اسی کو دوسرے انسانوں نے ایک ماورائی شخصیت بنا کر پیش کیا۔ ایک ایسی شخصیت جس کی اسے تمنا تھی اور وہ ناپید تھا۔ اسی بنا پر اس نے تاریخ سے ایک معمولی شخصیت کو چنا اور اسے ایک عظیم دیومالائی شخصیت بنا دیا۔ وہ شخصیت جو حقیقت سے عاری اور اس کے ذہن کی پیداوار تھی۔

اس کی ایک مثال ابو مسلم ہے جسے ہم سب جانتے ہیں۔ ابو مسلم ہمارے خراسان میں ایک جھاڑ جھونکنے والا غلام تھا۔ یہ ہمیشہ روٹی، پانی اور مقام و منزلت کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا تھا۔ اس کے لئے ہر چیز برابر تھی ایرانی طاقتیں ہوں یا عرب، تشیع ہو کہ غیر تشیع اسے کسی سے ہمدردی نہیں تھی کسی سے وابستگی میں عار نہیں تھا۔ وہ ایک جاہ پرست اور ماجرا طلب انسان تھا اور اس میں حکمرانی اور فوجی انتظام کی بھرپور صلاحیت بھی موجود تھی بنی امیہ کمزور پڑ چکے تھے۔ عباسیوں کی تحریک زوروں پر تھی معلوم تھا کہ ہوا کا رخ بنی عباس کی طرف ہے اور آئندہ سالوں میں میدان انہیں کے ہاتھوں رہے گا

اس نے جھٹ اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دیا اور ان کی بڑی خدمت کی اور ساتھ ہی اُونچے رُتبوں تک پہنچنے کے لئے جرائم سے بھی دریغ نہیں کیا اور ان رُتبوں تک اس کی رسائی بھی ہوئی لیکن ابھی وہ اپنی آخری آرزو تک پہنچنے بھی نہیں پایا تھا کہ اس کا کام تمام کر دیا گیا جب تک اس کا جینا سود مند تھا خلیفہ نے اسے اپنے ساتھ رکھا اور جب وہ اپنی آخری آرزو کے قریب پہنچا تو خلیفہ نے تالی بجائی اور پردے کے پیچھے سے خلیفہ کے کارندوں نے دوڑ کر اس کا کام تمام کر دیا اور یوں یہ قصہ اختتام کو پہنچا۔ تو یہ ہے ابومُسلم کی داستان۔ لیکن جب ہم کتابوں کی ورق گردانی کرتے ہیں اور اس کے قصے سُنتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ ہمیں یہ ابومسلم دکھائی نہیں دیتا بلکہ پوری تاریخ میں عظیم ترین انسانوں کی فہرست بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔

پہلے تو ابومُسلم کو زندہ قرار دیا گیا ہے۔ مُوت ہرگز اس پر طاری نہیں ہوتی ثانیاً وہ شکست نہیں کھاتا اور ثالثاً اس کا ظہور ہوگا۔ اور پھر سے وہ اپنا کام جاری کرے گا۔ آپ اسے ترکی، ایران ہر جگہ ہر شب پائیں گے۔ وہ سب جگہ موجود ہوگا اور پھر ہم اسے ایک بہت بڑی شخصیت، بہت بڑا حکیم، بہت بڑا صاحب اخلاق اور بہت بڑا مقتدر بھی پاتے ہیں جو حقیقی ابومسلم سے کسی طرح بھی مشابہ نہیں۔

اسی طرح اسکندر کو دیکھ لیجئے۔ "پور داود" اس سے تنگ آچکا تھا۔ وہ عمر کے آخری حصہ تک چیختا رہا کہ اس ملعون کو آخر کیوں اس قدر

بڑا، مقدس اور عظیم بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اسکندر ایک یونانی نوجوان تھا اس نے ایران پر چڑھائی کی اور اس پر غلبہ پا کر تخت جمشید کو جلا دیا اور ہخامنشیون کے جاہ و جلال کو نیست و نابود کیا۔ پھر مدتوں خود اور اس کے جانشینوں نے ایران پر حکومت کی اور ایران کی عظیم تمدن اور اس کے تمام بلند پایہ آثار کو یونانی فوجیوں کے پیروں تلے روند دیا۔ ایسے شخص کو ایران میں تاریخ کا ایک منفور فرد ہونا چاہیئے اور اسے ابلیس اور ملعون کے عنوان سے یاد کرنا چاہیئے۔ بہرحال اسکندر ایک فوجی ہے جو مغرب سے ایران پر حملہ آور ہوتا ہے اور "دارا" کو ختم کر کے ہخامنشیون پر غلبہ حاصل کرتا ہے اور پھر خود اور اس کے جانشین ایک مدت تک ایران پر سلطنت کرتے ہیں اس کے بعد انہیں شکست ہوتی ہے اور وہ چلے جاتے ہیں۔ اس طرح اسکندر بھی دوسرے فاتحین کی طرح تاریخ کا ایک جنگجو سالار تھا مگر پارینہ داستانوں میں اسکندر اس طرح کا انسان نہیں۔ اسی گمراہ، کمزور اور نادرست انسان کو جس نے فقط تاخت و تاراج، آتش زنی اور قتل و غارت گری کی قیمت پر شاندار مہمات کو سر کیا ایک ایسی شخصیت بنا کر پیش کیا جو موحد بھی تھا اور ناقابلِ شکست بھی۔ جس نے بچپن ہی سے انسانیت کی نجات کا سودا کیا اور اس کے لئے اپنی تلوار سونت لی اور جو زندہ بھی ہے۔ وہ اسکندر نامے جو شیعوں کی تحریر ہیں اس میں حد یہ ہے کہ اسے علیؑ کا مُحب قرار دیا گیا ہے جو حضرت سلیمان کے دربار میں حاضر ہو کر اہلِ دربار کو علیؑ دوستی کا سبق دیتا ہے۔ اسے مجموعہ فضائل بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

کیسے فضائل ؟ . . جو انسانوں میں پائے نہیں جاتے ۔ وہ فضائل جو انسانوں میں ہونے چاہئیں مگر نہیں ہیں اور نہیں ہو سکتے ۔ وہ کبھی نہیں مرتا کبھی شکست سے دوچار نہیں ہوتا اور کبھی تلوار اس پر اثر نہیں کرتی ۔ اور پھر اس میں کسی قسم کی اخلاقی اور نفسانی کمزوری بھی پائی نہیں جاتی اور اصولاً اس کا کام انسانیت کی نجات ہے اور اسی لئے ، اسی نجات کی خاطر اس نے ایران پر حملہ کیا اور باقی تمام حملے بھی اسی غرض و غایت اور توحید کی نشر و اشاعت کے لئے تھے ۔ اس طرح لکھنے والوں نے حقیقی رُوپ سے ہٹ کر اسکندر کو ایک عظیم خیالی دیوتا کے عنوان سے پیش کیا ۔

دیومالائی قصّوں یا مائیتھالوجی کی دوسری قسم وہ ہے جو بے بُنیاد ہو ، جس کی کوئی حقیقت نہ ہو ۔ فی الواقع ایسا کوئی واقعہ یا کوئی صورت نمودار نہ ہو دُنیا میں اس طرح کا کوئی انسان نہ ہو اور سب کچھ خیالی ہو ، جسے انسان نے اپنے ذہن سے تخلیق کیا ہو ۔ یہ سب چیزیں ذہن کے تراشے ہوئے بت اور وہ دیوی دیوتا ہیں جن کا انسان پجاری رہا ہے ۔ وہ انہیں کس طرح بناتا ہے ؟ بطور مثال ۔ انسان میں پائے جانے والے جذبات و احساسات میں ایک جذبہ و احساس ، مُحبّت ہے ۔ کسی فرد یا اجتماع سے بلا غرض بے کھوٹ اور بشدّتِ تمام دوستی ۔ اس مُحبّت میں اسے کسی قسم کی آلائش ، کمزوری ، خود خواہی ، ہوس پرستی اور نفس دوستی ناپسند ہے لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ تمام محبّتوں اور تمام چاہتوں میں آلودگی ہوس پرستی ، شخصی منفعت جوئی یا خود خواہی کے عناصر پائے جاتے ہیں تو وہ فوراً دل برداشتہ

ہو جاتا ہے راستہ چھوڑ بیٹھتا ہے ، اس کی مستی ختم ہو جاتی ہے ، وہ مسخ ہو جاتا ہے ۔ ہمیشہ اور ہر طرف پھیلی ہوئی یہ غیر سچائی اس کی آرزو کی تکمیل نہیں کرتی ، اسے پاک ، مطلق اور مقدس عشق کی ضرورت ہے اور ایسا عشق اور ایسی محبت اس انسان کے دل میں کبھی اُجاگر نہیں ہو سکتی جو اس مٹی پر ہزاروں دیگر خواہشات کے ساتھ سانس لے رہا ہے ۔ پس وہ کیا کرے ؟ کس طرح اپنی چاہت کو پورا کرے ؟ . . . مجبوراً اسے محبت کی دیوی تراشنی پڑتی ہے ۔ ایک احساس ایک فکر ، شخصیت کو جنم دیتی ہے ، جب ایک بیرونی تجسّم پیدا ہوتا ہے تو ایک بت وجود میں آتا ہے ۔ ایک دیوتا صورت پذیر ہوتا ہے ، ایک خیالی تصویر رونما ہوتی ہے ۔ اِنسان چاہتا ہے کہ وہ تاریخ کے کسی دور یا خود اپنے زمانے اور اپنے معاشرے میں ایسے اِنسان کو دیکھے جو مطلق طور پر جانثاری کے حدِ اعلیٰ پر واقع ہو یعنی جب دوسروں کے فائدہ کا موقع آئے ، معاشرے ، خلقت ، اِنسان اور بشریت کی بات آئے تو بربنائے چاہت و رغبت اپنے اغراض ، منافع اور مصلحتوں کو ان پر قربان کر دے اور اپنے آپ سے دوسروں کو مُقدم رکھے ۔ وہ تاریخ میں نظر دوڑاتا ہے روی ارض کے تمام اِنسانوں کو دیکھتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ کسی زمین پر چلنے والے حقیقی انسان میں یہ توانائی نہیں ہے اور نہیں ہو سکتی . . . ہمیں ایسے انسان ملیں گے جو فداکاری کی منزل پر ہوں گے ۔ ان میں جذبۂ فداکاری ہوگا مگر عین اس وقت ہمیں یہ محسوس ہوگا کہ "کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں" اس جذبہ کے پسِ پردہ یا خود خواہی ہوگی یا شہرت طلبی ۔ اگر کوئی شمشیر زن ہے تو

اس کے ۸۰ فیصد وار بربنائے عقیدہ و مصلحت ہوں گے اور ۲۰ فیصد اپنے اور اپنی لیاقت کے نمود کی خاطر ہوں گے اور کبھی تو جان دینے کی منزل میں بھی ہمیں واضح طور پر خودخواہی کا عنصر دکھائی دے گا۔ حقیقی مفہوم کے حامل انسان کے پاک ترین اور اعلیٰ ترین موت میں بھی کبھی خودخواہی اور خودبینی کا ایک سایہ سا دکھائی دے گا۔ مولانا روم اپنی مثنوی میں ایک عظیم مجاہد کی گفتگو کرتے ہیں جس نے جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور بے دریغ تلوار چلائی اور ہمیشہ میدان کارزار سے فاتح لوٹا۔ اپنی عمر کے آخری حصہ میں بیٹھا ان باتوں کو سوچ رہا تھا کہ کس طرح اس نے اپنی شمشیر زنی کی ڈھاک لوگوں پر بٹھائی اور جنگ کے خوفناک اور خطرناک میدان میں لوگوں پر کس طرح اپنی بہادری اور منیّت کا سکّہ جمایا اور اس میں اسے کتنا سکون اور کتنی مسرت حاصل ہوئی۔ گویا اس ابرازِ شہادت اور فداکاری میں بھی اس کا نفس اس کا شریک تھا۔ وہ اپنے اس طرزِ عمل پر نادم تھا۔ بڑھاپے میں اس نے گوشۂ عافیت سنبھالی اور عبادت کا خوگر بنا۔ میں یہ مثال کسی اور مسئلہ کے لئے پیش کر رہا ہوں مجھے اس کے اس عمل سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ ایک گوشہ میں بیٹھتا ہے اور نماز، ریاضت اور مشکل ترین اوراد کے ساتھ بڑی سخت اور بھاری زندگی اپناتا ہے اور مدتوں اسی عالم میں رہتا ہے۔ حالتِ ریاضت میں اچانک اسے طبلِ جنگ، شیپور اور تلواروں کی جھنکار سنائی دیتی ہے ... صاف ظاہر ہے کہ جہاد کا موقع ہے، میدانِ کارزار کی بات ہے۔ یہ بات عرصہ دراز تک جنگ و جہاد سے وابستہ رہنے والے اس بوڑھے

انسان کو ایک دفعہ پھر جوش میں لاتی ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر باہر آتا ہے جنگ کی آواز اور جنگ کا نام اس کے خون میں اُبال پیدا کرتا ہے۔ گوشۂ خلوت و رضایت اس سے چھوٹ جاتا ہے۔ اچانک وہ سنبھلتا ہے اور اپنے آپ میں آتا ہے کہ یہ میری خودخواہی اور میرا نفس ہے جو مجھے شہادت اور جہاد کے نام پر پھر دھوکہ دینا چاہتا ہے وہ اپنے نفس سے مخاطب ہوتا ہے کہ یہ جو آج پھر مجھے جنگ کی ترغیب دے رہے ہو اور اپنے عقیدہ اور دین پر قربان ہونے کو کہہ رہے ہو کل تمہاری حمیّت کو کیا ہو گیا تھا کہ جب میں جہاد پر جانا چاہتا تھا تو مجھے گھر کا گوشہ سنبھالنے کی ترغیب دیتے تھے اور کہتے تھے کہ اس دفعہ رہنے دو، اب تم کافی سے زیادہ خدمت انجام دے چکے ہو آخر ایک آدمی کب تک جنگ کرتا رہے گا۔ اب تم پر تکلیف ختم ہو چکی ہے ... وغیرہ، وغیرہ ... اب پھر کیوں مجھے جنگ کی طرف دھکیل رہے ہو۔ کیا تم وہ نہیں ہو جو مجھے جنگوں میں اس طرف دھکیلتے تھے جہاں خطرہ کم ہوتا تھا اور اس جگہ سے دُور رکھتے تھے جہاں خطرہ اور حتمی موت کا خوف رہتا تھا اب کیوں مجھے اتنے اصرار کے ساتھ جنگ کی دعوت دے رہے ہو؟ مجھے معلوم ہے تم ایسا کیوں کر رہے ہو اس لئے کہ اب جب میں نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ میں اپنی خودخواہی اور نفس کو کچل دوں تمہیں مار دوں اور اب کوئی چارۂ کار باقی نہیں ہے تو تم پھر مجھے دھوکہ دے رہے ہو کہ اگر مجھے مارنا ہی ہے، مجھے ختم ہی کرنا ہے تو اس طرح کیوں میرا گلا گھونٹتے ہو مجھے میدان کارزار میں لے چلو اور اس نبردگاہ میں سب کی آنکھوں کے سامنے مجھے قربان کرو تاکہ سب دیکھ سکیں کہ میں نے

قربانی دی ہے، میں نے اپنے آپ کو فدا کیا ہے تاکہ ایک مجاہد تو کہلایا جا سکوں۔ یہاں اس کو یہ نکتہ بتانا ہے کہ میں مجھے کیوں تدریجی موت سے ہمکنار کرتے ہو اس طرح تو کسی کو خبر نہیں ہوگی۔ کوئی نہیں جانے گا کہ میں نے یہ قربانی کس طرح پیش کی ہے۔ جب حضرت سلمانؑ ابوجہل کے سینے پر سوار ہوئے تو اس نے کہا میری گردن ذرا نیچے کی طرف سے کاٹنا۔ جناب سلمانؑ نے پوچھا کیوں! اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟ اس نے کہا تاکہ نیزہ پر بلند کرتے وقت سب سے اونچا ہو اور یہ سب کو معلوم ہو کہ یہ سر ابوجہل "کا ہے! یہ احساس تقریباً سب میں موجود ہے، کسی میں کم اور کسی میں زیادہ۔ البتہ بعض اوقات یہ اتنا ظریف اور اتنا لطیف ہوتا ہے یا تعبیر و تفسیر کے ایسے پردے اس پر حائل ہوتے ہیں کہ انسان خود اسے سمجھ نہیں سکتا۔ میرے ایک استاد کہتے تھے کہ کچھ لوگ جلسہ گاہ میں دیر سے پہنچتے ہیں اور لوگوں کے سروں سے گزر کر آگے پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آگے جگہ بھی نہیں ہوتی زبردستی جگہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب کی نظریں ان پر پڑتی ہیں کہ یہ کیسے خود غرض انسان ہیں۔ لیکن ایک شخص آتا ہے اور جوتوں کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ لوگ اصرار کرتے ہیں کہ آگے تشریف لائیے۔ مگر وہ نہیں مانتا۔ لوگ اصرار کرتے ہیں اور وہ انکار .... اور پھر یہ سننے میں آتا ہے کہ دیکھو کس قدر منکسر المزاج انسان ہے حالانکہ ممکن ہے اس میں خود خواہی کا عنصر زیادہ ہو۔ پہلے قسم کے انسان میں خود خواہی کا عنصر دوسرے قسم کے انسان سے اس لئے کم ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میری جگہ وہاں ہے اور میں وہاں جانا چاہتا ہوں وہاں جہاں سب لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں بالانشین ہوں۔ وہ صرف

یہی کہنا چاہتا ہے کہ گویا میری جگہ وہاں ہے، وہ خود آپ اپنا تعارف کراتا ہے کہ وہ جگہ اس کی ہے۔ دوسری قسم کا انسان بھی یہی کہنا چاہتا ہے وہ بھی اپنی بالانشینی کو ظاہر کرنا چاہتا ہے ... (۱) یہاں تک تو دونوں برابر ہیں لیکن اس منزل پر ایک اور چیز جو میں بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ دوسری قسم کا انسان بالانشینی کے اظہار کے ساتھ یہ بھی ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ وہ کتنا اچھا انسان ہے کہ مقام و منزلت رکھنے کے باوجود اسے اختیار نہیں کرتا اور اس طرح اس میں خود خواہی کے ایک عیب کا مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ منیت کبھی اس صورت میں بھی ظاہر ہوتی ہے اور نفسانی مسائل میں اچھی طرح ڈوبنے کے بعد کسی فرد کا صحیح چہرہ سامنے آتا ہے۔ انسان کے چہرے پر پڑی ہوئی اس نقاب کو ہٹانے کے بعد اس کی صحیح صورت دکھائی دیتی ہے اور اس ظاہری خوبصورتی میں اس بظاہر حقیقتِ مطلق میں اس کا نفس اور اس کی مصلحت کھل کر سامنے آتی ہے۔

لیکن انسان چاہتا ہے کہ اسے ایک ایسی شخصیت ملے جسے وہ عزیز رکھتا ہو جس پر بھروسہ کر سکتا ہو جسے پرستش کی حد تک چاہتا ہو اور جس میں ایثار و جانثاری کا جذبہ حدِ اعلیٰ پر ہو یعنی جہاں کسی قسم کی شخصیت پرستی، فرد پرستی، خود خواہی اور شخصی مصلحت کا دخل نہ ہو یہاں تک کہ اس اظہار کا شائبہ بھی نہ ہو کہ وہ ایک ایسی شخصیت ہے جو شہادت پیش کر سکتی ہے اور بہادری کے جوہر بھی دکھا سکتی ہے۔ دوسروں کے لئے اپنا تن، من دھن قربان کرنے والی اس پُر ایثار شخصیت کے دامن پر اس قسم کا کوئی داغ نہ ہو اور یہ بات ممکن نہیں، ایسی کوئی شخصیت موجود نہیں

(۱) اس کے بعد ٹیپ کا کچھ حصہ ناقابلِ فہم ہے۔

.... لیکن ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ہم تخلیق کرتے ہیں، پرومیتھس (PROMETHIUES) بناتے ہیں پرومیتھس یونان کا ایک مشہور دیوتا ہے جسے ایتھنز والوں نے بنایا لیکن بعد میں رُوم اور ساری دُنیا میں اس کی رسائی ہوئی۔ یہ یونانی دیوتاؤں میں سب سے زیادہ خوبیوں کا مالک ہے۔ خوبصورتی، طاقت، اچھائیاں اور محبوبیت سبھی کچھ اس کے پاس ہے۔ اس کی زندگی بڑی پُرسکون اور کامیاب ہے۔ اسے کسی چیز کی حاجت نہیں۔ وہ کسی کام یا کسی شخص کا محتاج نہیں لیکن وہ ایک ایسے کام پر ہاتھ ڈالتا ہے جو ایک ہنگامہ خیز فداکاری کا مظہر ہے۔ وہ انسان کی خاطر اپنے خلاف، اپنے عہدہ کے خلاف، اپنے دوسرے دیوتا ساتھیوں کے خلاف اور اس آسائش بھری زندگی کے خلاف قیام کرتا ہے جو تمام نعمتوں سے مالامال ہے۔ وہ اپنے خداؤں کی بستی سے، اس عالم برین سے جو ان کا اپنا مسکن ہے آگ چُرا کر چوری چھپے زمین پر سردی اور تاریکی کی تکلیف دہ زندگی بسر کرنے والے انسان کے حوالے کرتا ہے جو اس کا محتاج ہے اور پھر انسان کی تاریک شبیں اس سے روشن ہو جاتی ہیں اور وہ اس سے گرمی حاصل کرتا ہے، پھر کھانا بھی پکنے لگتا ہے اور انسان کی زندگی میں روشنی بھر جاتی ہے وہ آگ اس انسان کو نور اور گرمی عطا کرتی ہے جو اندھیروں اور دُکھوں میں اپنی زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔ انسانیت کے لئے اس سے بڑی خدمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی اشد ضرورت کو پورا کیا جائے چنانچہ پرومیتھس نے یہی کیا اور پھر پرومیتھس اپنے ساتھی دیوتاؤں کے غضب میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ وہی سلوک

ہوتا ہے جس کا اسے خدشہ تھا اس کے ساتھی اسے زنجیروں میں جکڑ کر قفقاز کی برفانی چوٹی پر واقع ایک کنوئیں میں قید کر دیتے ہیں اور پھر ایک گِدھ کو اس بات پر مامور کیا جاتا ہے کہ اس سیاہ، تاریک، سرد اور مہیب سناٹے سے معمور کوہستان میں جا کر اپنی نوکیلی چونچ سے اس کے جگر کے ٹکڑے نوچ نوچ کر کھائے۔ پرومیتھس اس شدید عذاب سے گزرتا ہے۔ گِدھ اسکے جگر کے ٹکڑے کھا کر ذرا دیر کیلیے اُڑتا ہے اور پھر دوبارہ نگاہ ڈالتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کا جگر پھر عود کر آیا ہے وہ پھر اسے کھانے لگتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے، جب سے پرومیتھس نے خداؤں کی مرضی کے بغیر جس میں وہ خود بھی شامل تھا آگ کو انسان کے حوالے کیا اور اس عظیم فداکاری سے گذرا آج تک قفقاز کے اندھے کنوئیں میں زنجیروں کی آغوش میں ایک گِدھ کا ہم نشیں ہے اور وہ گِدھ مسلسل اس کا جگر کھا رہا ہے۔ یہ ہے پرومیتھس کی داستان جو آج بھی اسی طرح قائم ہے... قفقاز جانیوالوں نے شاید دیکھ ہی لیا ہوگا... (حاضرین کی ہنسی)...

یہ سب کچھ کیا ہے؟ ایسا کوئی آدمی ہے؟ ایسا کوئی خدا ہے، ایسی کوئی دُنیا ہے؟ اس عالم میں کوئی ایسا شخص نہیں جو ان باتوں پر یقین کرے پھر کیوں اس طرح پرومیتھس کی تخلیق ہوئی؟.. اس لئے کہ انسان کو اس کی ضرورت تھی اور وہ نہیں تھا۔ انسان کو اس حد تک خود گذشتگی اور جان نثاری کے مظہر کی ضرورت تھی لیکن تاریخ میں ایسا کوئی انسان اسے نہیں ملا۔ کسی دور میں ایسی کوئی شخصیت اسے نہیں ملی... اسے معلوم تھا کہ مادی اور معنوی نعمتوں میں غرق سعادت مطلق کا حامل انسان بلکہ عالم خدائی میں خدائی پر فائز ہستی جسے تمام زیبائیاں اور تمام آسائشات فراہم ہوں انسان نامی کسی اور نوع کی سعادت اور بھلائی

کے لیے اپنے آپ کو اس اذیت میں مبتلا نہیں کر سکتا، اس طرح خدائی سے دستبردار نہیں ہو سکتا، کوہ قفقاز میں اتنے وحشت ناک طور پر دائمی عذاب کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔۔۔ لیکن یہ پرومیتھس ہرگز اپنے کئے پر پشیمان نہیں۔ "پابند سلاسل پرومیتھس" سے متعلق تمام داستانوں نے کبھی اسے مایوس اور افسردہ نہیں دکھایا۔ "آنڈرے جید" کی داستان موجودہ دور کی سب سے جدید داستان ہے۔ وہ فرانس کا ایک بڑا مشہور اور روشن فکر صاحب قلم تھا جسے مرے ہوئے ابھی چند سال ہی گزرے ہیں۔۔۔ پرومیتھس کے سیکڑوں داستانوں میں اس کی داستان بھی شامل ہے اور آج بھی تھیٹر کی صورت میں منظر عام پر لائی جارہی ہے۔۔۔ اس لئے کہ انسان کو پرومیتھس کی ضرورت ہے یعنی وہ اسی طرح کا احساس اور اسی طرح کی قربانی چاہتا ہے۔۔۔ جو نہیں ہے۔ اسے زیبائیوں کی ضرورت ہے لیکن تمام زیبائیاں اضافی ہیں، وقتی ہیں، بیماریاں انہیں بدل دیتی ہیں، موت انہیں ختم کر دیتی ہے۔ تمام خوبصورتیاں وقتی، مصنوعی، ناپایدار، اضافی اور ناقص ہیں۔۔۔ لیکن اسے ایسی خوبصورتی اور ایسی زیبائی کی ضرورت ہے جو مطلق ہے لیکن وہ نہیں ہے، تو اب "وینس" بنایا جاتا ہے کیونکہ ہم اپنی بہت سی چاہتوں اور ضرورتوں کو نفسیاتی فریب کے ذریعے پورا کرتے ہیں۔ "وینس" ظہور میں آتا ہے، زیبائیوں کا وہ مظہر جس میں کسی قسم کے ضعف، نقص، بدنمائی یا زمانے کے اثرات کا دخل نہیں جو مطلق ہے۔ انسان کو عظمت اور بزرگی کی بھی ضرورت ہے لیکن تمام بزرگیاں اضافی ہیں۔ "بزرگ تر" تو ہے مگر "بزرگ ترین" کا کہیں پتہ نہیں۔ بے نقص اور جاودانی طور پر مطلق روحی یا فکری عظمت و بزرگی کا حامل انسان جس سے کبھی

کوئی لغزش سرزد نہیں ہوئی ہو موجود نہیں لہٰذا وہ اس کی تشکیل کرتا ہے۔ انسان کو زندگی بھی درکار ہے۔ اسے ایک ایسی تاریخ کی ضرورت ہے جو ماورائے زمان و مکان ہو جس میں خود خواہی و بدصورتی کا عنصر نہ ہو۔ لیکن تمام قوموں کی تاریخ، تمام تاریخی شخصیتیں ناقص ہیں، ان میں آلودگی ہے، گم کردہ راہی ہے، ان میں کوئی مطلق نہیں اگر ایک طرف خوبصورتی، اچھائی، بلندی اور تقدس ہے تو دوسری طرف پلیدی، آلودگی اور ضعف و شکست بھی ہے۔ تمام تاریخی شخصیتیں شکست سے دوچار ہیں، ان پر موت واقع ہوتی ہے۔ ان سے کمزوریاں سرزد ہوتی ہیں۔ تاریخ ان حقیقی انسانوں کی مجموعی زندگی ہے جو اپنی کمزوریوں اور اپنے غرائز کے ساتھ زمان و مکان کے دائرۂ عمل میں ہیں۔ لیکن اسے ایسی تاریخ کی ضرورت ہے جسے ہونا چاہیئے مگر نہیں ہے ایک ایسی شرح حال اور ایسی افرادی شرح زندگی جو ضروری ہے مگر نہیں ہے۔ "اساطیر" یا "دیومالائی" داستانیں عبارت ہیں اس تاریخ سے جسے ہونا چاہیئے مگر نہیں ہے۔ اس بنا پر انہیں بنایا گیا۔۔۔ ان کی صورت گری ہوئی اساطیر وجود میں آئے۔ یہ اساطیر یا دیومالائی قصے انسان کی وہ ضرورتیں ہیں جسے حقیقی تاریخ نے سیراب نہیں کیا جن کی حقیقت مسلم ہے لیکن وہ دائرۂ عمل میں نہیں ہیں لہٰذا "اساطیر" بنائے گئے۔ انسان نے دیومالائی قصے تراشے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے۔۔۔ مجھے آریائی نسل کے ایک زورآور پہلوان کی ضرورت ہے، اب میں جس پر نظر دوڑاتا ہوں وہاں نقص دکھائی دیتا ہے۔ ہر کوئی کسی نہ کسی جنگ میں شکست سے دوچار رہا ہے یا

کہیں نہ کہیں کسی کمزوری کا شکار ہو کر اپنی ہستی کھو بیٹھا ہے تو اب میں سیستان سے ایک دلاور کو ڈھونڈ کر اسے رستم بناتا ہوں جو تین سال کی عمر سے لڑنے جاتا ہے۔ جسے کبھی شکست نہیں ہوتی اور اگر کبھی مجبوری سے اسے شکست سے ہمکنار کرنا ہو تو خود اس کے اپنے لڑکے کے ہاتھوں اسے شکست دیتا ہوں کہ اس میں بھی اس کی بزرگی کا ایک امتیاز برقرار رہے۔ اسے ہرگز کسی اور کے ہاتھوں شکست نہیں کھانی ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو سیمرغ اور دوسرے پرندوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے اور نیزہ کی انیوں سے پٹے ہوئے "شغاد" کے کنوئیں میں گھوڑے سمیت گر کر بھی نہیں مرتا۔ وہ اب بھی کسی دیہات میں زندہ ہے اور کھیتی باڑی کر کے اپنی زندگی گزار رہا ہے کیونکہ اس ہیرو کو مرنا نہیں چاہیے۔ کنوئیں میں گراتے ہی اسے صفحہ ہستی سے ختم نہیں ہونا چاہیے۔ اسے زندہ رہنا چاہیے، جاوید اور مخلد۔ کسی جنگ میں اسے شکست نہیں کھانا چاہیے کسی منزل پر اس میں کمزوری نہیں آنی چاہیے۔ آلودگی اور پلیدی کو بھی اس سے دور رہنا چاہیے۔ یہاں تک کہ رستم جب توران میں افراسیاب کی سرزمین پر پہنچتا ہے تو وہاں سے اسے "تہمینہ" نامی ایک لڑکی سے عشق ہو جاتا ہے اس منزل پر انسان اچانک متوجہ ہوتا ہے کہ اس کا ہیرو، اس کی طاقت، ہمت اور اچھائیوں کا مظہر ایک غیر شرعی اور غیر قانونی عشق میں ملوث ہو کر خطا اور برائی سے ہمکنار ہو رہا ہے اور یہ ہوس پرستی اس کے دامن پر داغ لگا رہی ہے جو ایک حقیقت بھی ہے ...تو اب کیا کیا جائے، اسے کیسے بچایا جائے؟ اسی آدھی رات کو "فردوسی" زرتشتیوں کے روحانی پیشوا کی تلاش میں نکلتا ہے جو آ کر ان دونوں کو رشتۂ عقد

میں منسلک کرتا ہے تاکہ بعد میں اس کا فرزند نامشروع نہ کہلائے اور رستم کی زندگی، حقیقتِ حال کے برعکس اس بدنما داغ سے محفوظ رہے۔

جہاں نقص ہوتا ہے، وہاں اساطیر یا فرضی داستانیں تراشے جاتے ہیں جہاں کوئی ہیرو مرتا ہے اساطیر اسکا پیچھا کرتے ہیں ... کوئی کمزوری یا پلیدی دکھائی دیتی ہے اساطیر اسے دھو دیتے ہیں اور پھر دیومالائی داستانوں کے عنوان سے ایک تاریخ بنتی ہے۔ وہ تاریخ جسے ہونا چاہئے مگر نہیں ہے بلکہ نہیں ہو سکتی۔ اس میں وہ انسان ہیں جنہیں ہونا چاہئے اور نہیں ہیں اور نہیں ہو سکتے۔ اس میں وہ روابط، وہ واقعات اور وہ احسات ہیں جنہیں ہونا چاہیے لیکن نہیں ہیں، ہم ان روابط اور ان احساسات کو قدیم ترین انسانوں کی سرگزشت میں پاتے ہیں اور یہ اساطیر یا دیومالائی داستانیں ابتدائی انسانوں ہی کا سرمایہ ہیں تاہم آج بھی اس کی صورت باقی ہے۔ آج کریشنا اور اس کا عشق منظر عام پر ہے مگر جب ہم دیکھتے ہیں تو اس نوعیت کا عشق دائرۂ امکان سے باہر ہے، روئے ارض پر اس کا وجود ناممکن ہے، ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا... اٹلی کے ایک چھوٹے سے شہر "واردنا" میں ایک مقبرہ ہے جو معبد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جوان، بوڑھے، شاعر، صاحبانِ قلم، صاحبانِ ہنر اور روشن فکر افراد کی ایک کثیر تعداد، ایک عجیب احساس، عجیب التہاب اور عجیب مذہبی انداز سے احترام کے ساتھ اس معبد میں داخل ہوتے ہیں اور یہ آرام گاہ ان کے لئے بڑا مقدس اور قابل احترام ہے۔ وہاں دو قبریں ایک دوسرے کے کنارے واقع ہیں۔ یہ قبریں کس کی ہیں؟ یہ مزار جس پر تختی وغیرہ سب ہی کچھ ہے "رومیو جولیٹ" سے متعلق ہے۔ رومیو، جولیٹ ہیں کون؟ کوئی نہیں ایک قدیم داستان کے دو

کچھ بھی نہیں جسے بعد میں شیکسپیئر نے ایک تھیٹر کی صورت میں پیش کیا۔ یہ کہانی بھی لیلیٰ مجنوں کی طرح حقیقت سے عاری ہے لیکن یہاں ان کا مقبرہ ہے۔ دو انسانوں کا مقبرہ جسے ایک لکھنے والے نے اپنی فکر سے جنم دیا یعنی انسان کو اس پاکیزہ احساس کی ضرورت تھی جو رومیو جولیٹ کی صورت میں نمودار ہوا اور جس کی کوئی حقیقت نہیں اور جو کبھی معرض وجود میں نہیں آیا خود لکھنے والوں نے بھی کہا ہے کہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ فردوسی کو اپنے مقام پر اعتراف ہے اور وہ کہتا ہے:

کہ رستم یلی بود در سیستان منم کردمش رستم ایں رابدان

یعنی رستم سیستان کا ایک معمولی پہلوان تھا جسے میں نے رنگ آمیزی سے رستم بنایا۔ آخر کیوں؟ اس لئے کہ ایران اور اہل ایران کو ایسے ہی ایک رستم کی ضرورت تھی جو ان کے پاس تھا۔ پس ہم اسی طرح کے نوجوانوں کو چنتے ہیں اور اس میں رنگ آمیزی کرتے ہیں یا سرے سے ان کا وجود ہی نہیں ہوتا اور ہم اسے گڑھتے ہیں۔ انسان اس طرح کے احساسات کا اس قدر خوگر ہوتا ہے کہ داستان بناتا ہے اور رومیو جولیٹ کے قصے میں جب یہ دونوں دیکھتے ہیں کہ ان کے لئے وصال ناممکن ہے تو خودکشی کو اختیار کرتے ہیں تاکہ ایک دوسرے کی آغوش میں موت سے ہمکنار ہوں۔ ان کو کتاب میں موت واقع ہوئی لیکن ان کا مقبرہ بھی ہے اور ساری دنیا اس سے واقف ہے... یہ دیومالائی یا اساطیری مسئلہ تو نہیں، یہ وہ مسئلہ ہے جو بطور قصہ سترھویں صدی میں رونما ہوا اور انیسویں صدی میں ان کا مقبرہ بنایا گیا۔ اس مقبرے کے بنانے والے اور تمام زائرین کو اس کا علم ہے کہ اس میں کچھ بھی نہیں۔ یہ ایک بناوٹی داستان ہے: اسے بنایا گیا ہے، لیکن زیبائیوں سے انسان کا لگاؤ اور اس درجہ

پاک احساسات اور بدی سے منزہ انسانی روابط کی چاہ انسان میں اتنی شدید ہے کہ جہاں ایک نفسیاتی ضابطہ یہ کہتا ہے کہ "کبھی چاہت اتنی شدید ہوتی ہے کہ اس سے ایک بیرونی تجسم نمودار ہوتا ہے" اور اوپر کا واقعہ اس کی ایک مثال ہے حتیٰ کہ جن لوگوں پر حقیقت عیاں ہے اور وہ بیرونی تجسم کے اس دھوکے سے واقف ہیں انہیں بھی ایک ایسی منزل، ایک ایسے انسان اور ایک ایسے داستان کی ضرورت ہے چنانچہ داستان سازی کی ہے اور اسے عینیت بخشی ہے حالانکہ سب جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے یہ سب جھوٹ ہے فریب ہے لیکن انہیں اس کی چاہت ہے اور ایسی چاہت ہے کہ جھوٹ کو بھی اپنا لیا گیا ہے۔ ہم ایک ایسی بلندی اور ایسی قربانی چاہتے ہیں جیسے پرومیتھس کی تھی حالانکہ ہم پرومیتھس کی حقیقت سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ ہم نے خود اسے بنایا ہے مگر ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ "جیڈ" نے اسے لکھا اور جیسا کہ تمام اہل یورپ نے "جیڈ" کے پرومیتھس کو ترجمہ کیا اور ہمیشہ تمام تھیٹر اسے پیش کرتے ہیں۔ انسان کو پرومیتھس کی چاہت رہی ہے لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں لہٰذا ہم اسے بناتے ہیں پھر اس کی پرستش کرتے ہیں' اسے چاہتے ہیں' اپنے سوچوں میں بساتے ہیں' وہ ہم میں احساس و خیال کی بستی بساتا ہے اور ہمارے احتیاج کی دائمی بھوک کو کسی قدر کم کرتا ہے۔ اس اعتبار سے اساطیر یا دیومالائی قصے ہمیشہ تاریخ اور انسان کے ساتھ ہیں۔ انسان کسی بھی معمولی خطاکار انسان کو جس کا ذرا سا نام کسی عنوان سے ابھرتا ہے یا کوئی معمولی امتیاز حاصل کرتا ہے ایک ایسے خیالی انسان میں بدل دیتا ہے جو اس کا

محبوب اور مطمحِ نظر ہے اور جسے ہونا چاہیئے اور جس کا وجود اس کے لئے ضروری ہے اور انسان اس کا حاجت مند ہے۔ یا پھر وہ کسی موہوم چیز کو عینیت بخشتا ہے اور اسے بناتا ہے . . . اور اس طرح اساطیر یا دیومالائی داستانیں وجود میں آتی ہیں۔ یہ دیومالائی داستانیں ہر احساس، ہر تقدس، ہر معنوی اور مادی جمال کا عالی ترین نمونہ ہوتے ہیں اور ہم نمونہ سازی سے کام لیتے ہیں۔ لیکن جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ نہیں ہے۔ جسے ہونا چاہیئے وہ ہے۔ انسان عظمتوں اور بلندیوں کے اعلیٰ نمونے بناتا ہے اور یہ نمونے ہندوستان میں رامائن، چین اور جاپان میں "فتوشی شی شی" رُوم میں "رتوس" یا "آرسیس" اور یونان میں کسی اور صورت سے اُبھرتے ہیں۔ انسان ایک ایسے موجود کو دیکھنا چاہتا ہے جس کی زبان سے نکلے ہوئے جملے ایک مطلق زیبائی کے حامل ہوں جس کی گفتگو عام روزمرہ کی زبان نہ ہو وہ خود ایک مقدس اور عظیم سراپا زیبائی ہو اور ایسی کوئی ہستی موجود نہیں۔ ہر گفتگو عام اور معمولی ہے ہر بات معمولی مسائل پر مبنی ہے۔ اگر کوئی ایسی بات میں خوبصورتی سموتا بھی ہے تو وہ معمولی ہوتی ہے اس میں کوئی تشبیہہ یا کوئی کنایہ یا کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو حقیقت سے عاری ہو اور جس پر جھوٹ، مصلحت یا بُرائی کی چھاپ ہوتی ہے۔ ہمیں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس میں صداقت و سچائی ہو اور جو زبانی اور کلامی خوبصورتی سے مزین و مملو ہو لہٰذا ہم "ڈمونس" DMONS اور "تیر" جیسے مظاہرِ سخن بناتے ہیں۔ ہمیں اس حد تک فداکاری اور جانثاری کا عنصر کسی میں نہیں ملتا لہٰذا "پرومیتھس" بناتے ہیں۔ ضعف، پلیدی اور آلودگی سے پاک عشق و محبت کے لئے ہم فداکاری سے متعلق ایک مجسمہ تعمیر کرتے

ہیں، ایک ایسا دلاور اور مردِ مبارز بناتے ہیں جس نے کبھی کسی میدان میں شکست نہ کھائی ہو اور یہ "ہرکولیس" کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے تمام صاحبانِ قوت شکست سے دوچار ہوتے ہیں۔ ان کی طاقت و شہامت ایک خاص وقت تک محدود ہوتی ہے جس کے بعد ان کی ہمت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے طاقت کے مظاہرہ میں زیبائی حدِ کمال پر نہیں ہوتی، وہ بے ریب نہیں ہوتا اس میں آلودگی ہوتی ہے، اسی لئے "ہرکولیس" بنایا جاتا ہے، ہندوستان میں رامائن جنم پاتا ہے اور تمام مظاہرِ قوت کی یہی تاریخ ہے۔ مشرقی یورپ میں رُوس، "لاٰس" کو سامنے لاتا ہے اسی طرح ہم محبت اور مہربانی کے نمونے بھی تراشتے ہیں۔ ہر تمدن اور ہر مذہب ایک ایسے محبت بھرے انسان کا نمونہ پیش کرتا ہے جس کی پوری زندگی لائق محبت ہے، لائق چاہت ہے، جو سراسر خیر اور دوسروں کے لئے باعثِ برکت ہے اور ہم اسے اس لئے بناتے ہیں کہ وہ ہماری تمنا ہے۔ ہماری ضرورت ہے مگر کہیں موجود نہیں۔ ہمارا مطمحِ نظر ایک ایسا انسان ہے جو حقیقت، پاکیزگی اور اس مقصد کے حصول کے لئے اپنے جی سے گزر جائے جو اس کے نزدیک اعلیٰ اور مقدس ہے اور اس راہ میں اپنی زندگی اُجاڑ دے اپنا مستقبل تاریک کرے۔ اور مشکلوں میں گھر کی اس ایزارسانی کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے۔ لیکن ہمیں تاریخ میں ایسی کوئی شخصیت نہیں ملتی لہٰذا ہم اسے بناتے ہیں نمونہ سازی کرتے ہیں ان پاکیزہ رابطوں اور مطلق احساسات کو ہمیشہ داستان کی صورت دیگئی بلکہ آج بھی دی جارہی ہے۔ آج بھی رومانی داستانیں، قصے، فلم اور تھیٹر پیش

ہوتے ہیں جو سب کے سب جھوٹ اور فریب ہیں . . . اور ہم اسے مثبت عمل قرار دیتے ہیں اس لئے کہ انسان کو زندہ رہنے کے لئے اعلیٰ، پاکیزہ اور مطلق نمونوں کی ضرورت ہے جسے وہ زندگی کی راہوں میں ہمیشہ پیش نظر رکھے، خواہ وہ نمونے دیومالائی یا خیالی داستانیں ہی کیوں نہ ہوں، حقیقت سے عاری کیوں نہ ہوں انسان کی سکون اور اصلاح کا باعث تو ہیں۔ انسان ہمیشہ ان سے اپنی روح میں بالیدگی محسوس کرتا رہا ہے۔ پرومیتھس اور دلاوری کے اس جیسے نمونے ہمیشہ روح انسانی میں سرچشمۂ الہام و فداکاری رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج نفسیات میں اور خاص طور پر تربیتی نفسیات میں زیبائیوں، عظمتوں اور فداکاریوں کے ان عظیم نمونوں کی بڑی حیثیت ہے اور لوگ انہیں قبول کرتے ہیں اور انہیں انسان کی اصلاح اور روحانی تکامل کے عظیم ترین نمونے اور مربی جانتے ہیں۔

لیکن ہمیشہ سے انسان کی یہ خواہش رہی ہے کہ زیبائی، اتقدس، محبت، شہامت، سخن پردازی اور فداکاری کے یہ مختلف بکھرے ہوئے نمونے سمٹ کر ایک ہو جائیں اور پوری تاریخ میں ہم اس کوشش کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

کیوں؟ اس لئے کہ وہ دیوتا جو مظہر فداکاری ہے، "پرومیتھس" جو انسان کے لئے فداکاری کا مظہر ہے اعلیٰ سطح پر ہماری روح کو مطمئن نہیں کرتا۔ وہ اپنی اس عظیم صفت کے ساتھ "ہرکولیس" کی طرح طاقت ور نہیں ہے اس میں "اورسیس" ORSIS کی طرح خوبصورتی نہیں ہے یا پھر وہ "ڈیموستھنس" کی طرح سخن پرداز نہیں ہے اور دوسرے دیوتاؤں کے سامنے اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔

اور یہ بات اس کے لئے باعث رنج ہے اور اس میں اس طرح کا نقص نہیں ہونا چاہیے . . . یہی وجہ ہے کہ ہم پوری دیومالائی تاریخ میں اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ آہستہ آہستہ دیوتاؤں کی تعداد میں کمی واقع ہوئی اور ہر دیوتا اپنے اندر کئی قسم کی خوبیوں کو سمیٹنے لگا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ تمام مظاہر، یہ تمام خیالی نمونے یہ تمام جھوٹی داستانیں یہ سب اساطیر، یہ سب دیومالائی قصے، انسان کی تربیت، اصلاح اور تکامل فکر و احساس کے لئے ایک ٹیبلو اور سرچشمۂ الہام رہے ہیں اور یہ وہ بات ہے جسے سب مانتے ہیں . . .

لیکن تاریخ میں ان عقائد اور تعصبات سے صرف نظر جو ہمارا خاصہ ہیں ایک ایسی ہستی دکھائی دیتی ہے جو ان تمام اعلیٰ اور مطلق عظمتوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور جو روئے ارض پر ایک انسان میں نہیں ہو سکتیں لیکن ان کا ہونا ضروری ہے، انہیں ہونا چاہیے مگر ہیں نہیں۔ وہ اپنے وجود سے "ہرکولیس" یا رامائن کی صورت میں انسان کی قوت شہامت اور شکست ناپذیری کے بنائے ہوئے ان مظاہر کو جن کا وہ ہمیشہ طلبگار رہا ہے سچائی بخشتا ہے۔ اس کا نطق اور اس کی استعداد گفتگو اس درجہ بلند، خوبصورت، دل آویز اور دلنشین ہے کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی اور یہ انداز سخن انسان کی اس چاہت اور ضرورت کو پوری کرتا ہے جس کے تحت اس نے "تیر" یا "ڈیموستھنس" جیسے دیوتا بنائے تھے۔ اس کے وجود میں وہ جنگی مہارت اور وہ کارزاری طاقت محفوظ ہے جو تمام قوموں اور تہذیب و تمدن کی

ہر تاریخ میں مختلف اساطیری یا دیومالائی مظاہر کا حصہ رہے ہیں۔ اس کی ذات متناقض نمونوں کا ایک مجموعہ ہے۔ وہ ایک طرف مردِ سخن ہے تو دوسری طرف مردِ شمشیر۔ اس نے نوعِ بشر کی خاطر مطلق فداکاری کے اس جذبے کو تاریخی صورت دی جسے انسانوں نے ہمیشہ پرومیتھس کے روپ میں ظاہر کیا۔ وہ انسانوں کی سعادت، بھلائی اور خوشحالی کے لئے اپنے مقام، اپنی منزلت، اپنی خوشی، حتیٰ اپنے سکون اور اپنی قوت سے دست بردار ہو جاتا ہے اور دوسروں کے لئے اپنی اور اپنے گھر والوں کی شکست کو صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرتا ہے اور ان کی مصلحت کے پیشِ نظر پرومیتھس کی طرح زنجیر کی سختیوں، گدھ کی اذیت رسانیوں اور جگر خواری کے کرب کو جواں مردی اور پائیداری کے ساتھ سہتا ہے۔

"علیؑ" گوناگوں عظمتوں، پاکیوں اور خوبصورتیوں کا وہ مجسم پیکر ہیں جس کی انسان کو ایک عرصے سے تلاش تھی اور جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور اسی بنا پر اسے یہ یقین حاصل ہو گیا تھا کہ روئے ارض پر ایک انسانی پیکر کے روپ میں یکجا ان خوبیوں کا ملنا محال اور ناممکن ہے لہٰذا مجبوراً اس نے تخلیق سے کام لیا۔ علیؑ نے اپنے اندر ان تمام خوبیوں اور اعلیٰ ظرفیوں کو سمیٹ لیا تھا جسے دیومالائی داستانوں نے کبھی پرومیتھس کبھی "ڈیونسس" اور کبھی "وینس" یا "فتوشی" یا بلندی، بے باکی اور شکست ناپذیری سے متعلق دوسری صورتوں میں سمو دیا تھا اور ان ذرائع اور ان مجسموں سے عظمتوں، محبتوں اور برکتوں بھری روح کا مظاہرہ کیا تھا۔ علیؑ نے پوری تاریخ میں اپنے طرزِ حیات سے انسانوں کی ان آرزوؤں، چاہتوں اور ضرورتوں کو سیراب کیا جس کے لئے وہ فرضی، خیالی

اور من گھڑت دیوتاؤں کی صورت گری کرتے تھے۔ یہ دیوتا انسانوں کو یہ سمجھاتے تھے کہ انسان کا احساس اور اس کی فکری استعداد اس حد تک آگے بڑھ سکتی ہے اور انسان جو کسی طرح بھی اس حد تک پہنچنے کے قابل نہ تھے انہیں اس درجہ، اس عظمت، اس نمونۂ حیات اس اندازِ فکر و نظر اور اس رہِ حیات کو اپنانا چاہیئے جو ان کی ترقی و تکامل کے لئے ضروری ہے۔ لیکن علیؑ نے تاریخ میں ان تمام صفات، ان تمام نمونوں اور ان تمام صلاحیتوں کو جنہیں ہم دیومالائی داستانوں کے لا۔ لامختلف دیوتاؤں کی صورت میں بکھرا ہوا دیکھتے تھے اور جو کسی طرح بھی حتیٰ ایک فرضی دیوتا میں مجموعی طور پر ناممکن تھا حیرت انگیز طور پر اپنے وجود میں سمیٹ لیا۔

جنگ کے میدان میں ایک فرضی دیوتا کی طرح علیؑ کی تلوار، ان کی شجاعت، شہامت، بیباکی اور شدید طاقت، ہمت اور حوصلہ کا مظاہرہ انسان کی اس چاہت اور ضرورت کو پورا کرتا ہے جسے اس نے بہادری سے متعلق اپنے اندر پیدا کر رکھا تھا اور دوسری طرف بازار میں ایک یتیم کے مقابل ہم آپ کی شخصیت کو انتہائی ضعیف، لرزاں اور پریشان خاطر دیکھتے ہیں جو اساطیری صورت میں ایک ماں کے رقیق ترین احساس کا آئینہ دار ہے۔ باہر میدانِ رزم میں دشمن کے ساتھ علیؑ کا رویہ اتنا سخت ہے کہ وہاں آپکی ذات سرتاپا مظہرِ خشونت ہے آپ کی تلوار مظہرِ تباہی، مظہرِ خونریزی اور مظہرِ بے رحمی ہے۔ اور اندر آپ سے زیادہ صابر اور آپ سے زیادہ عفو و درگزشت کرنے والا کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

علیؑ دیکھتے ہیں کہ اگر احقاقِ حق کے لیے ان کی تلوار نیام سے باہر آجائے تو اسلامی خلافت اور اسلامی حکومت کی بنیادیں ہل جائیں گی لہٰذا صبر کو اپناتے ہیں۔ ایک چوتھائی صدی تک صبر کرتے ہیں اور ایسے شرائط میں ایسی کیفیت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں کہ جس سے انسان میں بعینہٖ پابند سلاسل پرومیتھس کا احساس رونما ہوتا ہے۔ لیکن علیؑ انسان کی خاطر خود اپنے بدن کو زنجیروں کی گرفت میں رکھتے ہیں۔ ایک چوتھائی صدی تک وہ بیقرار روح خاموش رہتی ہے جو دس سال کی عمر سے اسلامی تحریک سے منسلک رہی۔ . . حُسنِ بیان کے سلسلے میں آپ بہتر جانتے ہیں اور نہج البلاغہ کی کتاب آپ کے اس حُسنِ بیان کا ایک کھلا مظہر ہے۔ لیکن میں علیؑ کے گوہر پاروں میں سے ایک گوہر کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جسے آپ نے آٹھ یا دس سال کی عمر میں ارشاد فرمایا تھا۔ حُسنِ تعبیر، حُسنِ معاملہ فہمی، حُسنِ بیان اور حُسنِ باطن۔ کیا کچھ نہیں اس میں۔ . . یہ ایک بچے کی گفتگو ہے۔ . علیؑ پیغمبرؐ کے گھر میں ہیں، بلکہ آپ ہی کے گھر پروان چڑھ رہے ہیں۔ . . کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو جناب خدیجہؑ اور جنابِ رسولِ خداؐ کو نماز کے عالم میں دیکھتے ہیں۔ علیؑ نے پہلے کبھی یہ صورت نہیں دیکھی تھی، متعجب تھے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ جب نماز ختم ہوئی تو علیؑ نے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ جنابِ رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ میں اللہ کی طرف سے نبوت پر مبعوث ہوا ہوں اور یہ نماز ہے جو میں اس کے حضور ادا کر رہا ہوں اور میں توحید اور نبوت پر تمہیں دعوت دیتا ہوں . . . ایک آٹھ دس سال بچہ۔ وہ کتنا ہی صاحبِ عقل و ہوش کیوں نہ ہو ایسے موقع پر کیا کہے گا؟ یا کچھ کہے بغیر بھاگ جائے گا یا پھر کہے گا: "آپ جو فرمائیں،

مجھے تو ان باتوں کا کوئی علم نہیں"۔ . . لیکن علیؑ کہتے ہیں: "مجھے اجازت دی جائے کہ میں اس بارے میں کچھ غور و فکر سے کام لوں"۔ . . ابھی آپ کی عمر صرف آٹھ ہی سال ہے ابھی وہ اسلام ہے اور نہ تاریخ، نہ تعلیمات ہیں اور نہ جنگیں اور بحثیں۔ ایک آٹھ یا دس سالہ عرب بچہ کہتا ہے مجھے سوچنے اور اپنے والد سے مشورہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ علیؑ نے تمام رات عالمِ فکر میں جاگ کر گزاری اور صبح آ کر کہا: "میں رات اپنے تئیں سوچتا رہا۔ میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ خداوندِ عالم نے میری خلقت کے موقع پر میرے پدرِ بزرگوار سے مشورہ نہیں کیا تھا تو اب اس کی پرستش پر مجھے اپنے والد کے مشورے کی ضرورت نہیں، آپ مجھے اسلام کی تعلیم سے سرفراز فرمائیں۔

اس حساس موقع پر خلافت کی دوسری کڑی نے جس عجیب زندہ شوریٰ کو بخیال خود اصحاب کی سب سے بڑی شخصیت "عبدالرحمٰن بن عوف" کی ریاست میں قائم کیا تھا اور معلوم تھا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا ہے علیؑ اور آپ کے خاندان کی تمام سرنوشت صرف ایک جملے "ہاں" میں تھی۔ سامنے کون تھا، شرط کیا تھی؟ . . . عبدالرحمٰن بن عوف اپنا ہاتھ علیؑ کے ہاتھ میں دے کر کہتا ہے میں خلیفۂ رسولؐ کے عنوان سے اس شرط پر آپ سے بیعت کرتا ہوں کہ آپ کتابِ خدا اور سنّتِ شیخین پر عمل کریں گے۔ علیؑ کا جواب کتنا دقیق، کتنا قاطع، کتنا متواضع اور کتنا پاکیزہ تھا۔ آپ نے فرمایا کتابِ خدا اور سنّتِ پیغمبرؐ پر جہاں تک ہو سکے "ہاں" عمل کروں گا، رہی سنّتِ شیخین کی بات تو میری خود اپنی ایک روش ہے اور میں اپنی اسی بصیرت پر عمل کروں گا۔ علیؑ جانتے تھے کہ اہلِ شوریٰ کو یہ بات اچھی

طرح معلوم ہے کہ: "میں سنتِ شیخین کی اتباع نہیں کروں گا اور میری خود اپنی ایک بصیرت ہے" اور یہ سیاسی ڈھانچہ جو تیار کیا گیا ہے وہ ان کے حق میں کتنا مہنگا ہوگا۔ وہ شوریٰ میں شریک ہر شخص سے بخوبی واقف تھے۔ عبدالرحمٰن ان کا ہم رزم تھا وہ اسے ۳۰ سال سے جانتے تھے۔ اس کے ساتھ انہوں نے ایک طویل عرصہ گزارا تھا، تمام واقعات میں آپ اس کے ساتھ تھے علیؑ کو ہر ایک کے بارے میں علم تھا۔ آپ حضرات طلحہ، عثمان، سعد، زبیر سبھی سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ بات کیا ہے اور کیا اسکیم بنائی گئی ہے اور اس جملہ کی قید کو کیوں رکھا گیا ہے؟ ساتھ ہی وہ بھی علیؑ سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ علیؑ حتیٰ اس جھوٹ سے بھی متمسک نہیں ہو سکتے جو تمام سیاستدانوں، تمام روشن فکروں اور تمام انسان دوستوں کے نزدیک جائز ہے۔

اس کے بعد "معاویہ لعن" اور خلافت کی داستان آتی ہے۔ ابھی حالات قابو میں نہیں۔ مدینہ میں امن و امان کا فقدان ہے۔ طاقتور سیاسی شخصیتیں علیؑ کی مخالف ہیں اور اس پر "شام" معاویہ کے زیرِ نگیں ہے۔ اہلِ شام معاویہ اور ابوسفیان کے علاوہ کسی کو نہیں جانتے خواہ وہ پیغمبر کا گھرانہ ہی کیوں نہ ہو۔ ایسی صورت میں ہر متوسط سیاست مدار یہ جانتا ہے کہ پہلے حالات کو کنٹرول کیا جائے۔ اندرونی خلفشار کو دور کیا جائے، حکام کی ادھر ادھر بدلی کی جائے۔ طاقت کو پوری طرح اپنے اختیار میں لیا جائے، اپنے خطرناک دشمن کو دھوکہ میں رکھا جائے، اس کی تائید کی جائے اور جیسا کہ بعد میں آنے والے خلفاء کرتے رہے ایک مناسب موقع پر جب خوب اچھی طرح حالات قابو میں آجائیں تو دشمن کا خاتمہ کیا جائے۔

لیکن علیؑ یہ جانتے ہوئے بھی کہ معاویہ کی برطرفی اور اس سے مخالفت ان کی ان کے بچوں اور ان کے خاندان کی تباہی اور ایک خوفناک جنگ کا پیش خیمہ ہوگی ایک لمحہ کے لئے بھی معاویہ کی حکومت کو برداشت نہیں کرتے۔ اور اس طرح تاریخ اسلام بعد میں معاویہ، بنی امیہ اور بنی عباس کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ علیؑ پر علم امامت سے نہیں تو علم سیاست سے یہ سب کچھ روشن تھا۔۔۔ اس لئے کہ آپ سیاست سے بھی متمسک رہے ہیں۔ آپ کو تمام اوضاع و احوال کا علم تھا۔ آپ دشمن کے تمام ساز و سامان ہتھکنڈوں اور بازوؤں سے باخبر تھے۔ علیؑ وہ ہستی ہیں جنھوں نے دس سال کی عمر سے سیاست، جنگ اور کشمکشوں کی آغوش اختیار کی۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی یہ روش ان کے لئے کتنی مہنگی ثابت ہوگی۔ حالات پوری طرح ان کے اختیار میں ہیں لیکن علیؑ شکست کو صرف اس لئے اپناتے ہیں کہ ان سے کوئی ناحق عمل سرزد نہ ہو۔ آخر کیوں؟ اس لئے کہ "علیؑ" امام ہیں۔ میں لفظ امام کو ایک سیاسی یا قومی رہنما کے مفہوم میں نہیں لے رہا ہوں۔ میرے نزدیک امام اعلیٰ انسانی فضائل سے مزین وہ ہستی ہے جسے عالم انسانیت اپنی پوری تاریخ میں بعد تلاش بسیار نہ پاکر ذہنی تخلیق سے ہمکنار ہوئی۔۔۔ اور ذہنی تخلیق کے ان عالی مقدار تصوراتی نمونوں کو ہمیشہ اپنی زندگی کا معیار قرار دے کر انہیں اپنا سرمشق بنایا اور اس کی پرستش کی اور انہیں عالم خاک اور حقیقی انسانوں سے بالاتر جانا۔

"علیؑ" مدینہ، عرب یا اسلامی معاشرے کے صرف سیاسی اور اجتماعی رہنما نہیں بلکہ ایک امام ہیں۔ آپ تاریخ اور انسان کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ

جن بے عیب، مطلق اور اعلیٰ فضائل کے درپے تھے اور ان کے لئے اپنے ذہن سے ناقابلِ تسخیر نمونے تراشتے تھے ان سب کو انہوں نے ایک انسانی فرد میں یکجا طور پر سمو دیا ہے۔ "میں ایک بولنے والی کتاب ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ "میں تمہارا رہبر و پیشوا ہوں" جسے ناقابلِ شکست اور ناقابلِ تسخیر ہونا چاہیے۔ "نمونے" یا معیار کو کبھی لغزش نہیں آسکتی۔ اس کی زندگی میں انتہائی معمولی کمزوری کی بھی گنجائش نہیں۔ اس کے فضائل، اس کے احساسات، اس کے سوچ کے طریقوں، اس کے کردار و عمل اور اس کی پوری زندگی میں کبھی کہیں کوئی چھوٹے سے چھوٹا جھول، کوئی چھوٹی سے چھوٹی آلودگی نہیں ہونی چاہیے۔

"امام" ہے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام بلند پایہ انسانی فضائل اور پسندیدہ خصائل کا ایک ایسا اَمر و لعزیز نمونہ ہے جسے سامنے رکھ کر انسان اپنی زندگی کو اس مدینۂ فاضلہ اور اس فضائلِ مطلق کے حامل انسان کے طرزِ حیات پر سنوار سکتا ہے جو اس عالم میں ناپید ہے اور ایک فرد میں مکمل اور یکجا طور پر ناقابلِ امکان ہے اور جس کی تلاش میں انسان ہمیشہ بھٹکتا رہا ہے۔ لیکن علیؑ نے ان بلند پایہ مطلق نمونوں کو اپنی ذات میں سمیٹ رکھا ہے آپ ایک مطلق اور اعلیٰ مثالی نمونہ ہیں۔

اس بنا پر "نمونۂ عدالت" کے عنوان سے علیؑ ایک ظلم کو بربنائے مصلحت قبول نہیں کر سکتے۔ مصلحت، حقیقت کو آلودہ کرتی ہے۔ علیؑ کی مصلحت آئندہ زمانے میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے فی الوقت معاویہ کو برداشت کرنا ہے۔ ہاں۔ ایک سیاسی رہنما کے اعتبار سے معاویہ کو برداشت کرنا جائز ہے لیکن یہ کام اس کے لئے کسی قیمت پر ناممکن ہے جو خود ایک نمونۂ عدالت ہو۔ وہ

عدالت جس میں کوئی کمزوری اور شکست نہ ہو جو کسی قیمت پر ذرہ برابر ظلم اور نادرستی کو برداشت نہیں کرتا۔ یہ کام اس کے لئے باعثِ ضعف و نقص ہے۔ علیؑ دنیا اور آنے والے مستقبل کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انہیں صرف مدینہ یا ساتویں صدی کی عرب قوم کا رہنما نہ سمجھا جائے۔ وہ آیندہ نسل کے مثالی نمونے کے عنوان سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب ہم کسی اصل کو حق سمجھتے ہیں یا کسی فضیلت کو فضیلت جانتے ہیں تو پھر ہمیں کسی مصلحت کی خاطر کبھی کسی پلیدی کسی کھوٹ اور کسی خیانت کو برداشت نہیں کرنا چاہیے خواہ اس میں ہمیں پر ومتھس کی سرنوشت ہی سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔ علیؑ کو اس کی پرواہ نہیں کہ ایک چوتھائی صدی تک مصیبتیں ان کا احاطہ کریں یا وہ اپنے فرزندوں سمیت مسلسل خطرے کی زد میں ہوں۔ انہیں تو کسی طور پر بھی چھوٹے سے چھوٹے نقص و ضعف کو برداشت نہیں کرنا ہے اس لئے کہ آپ پسندیدہ انسانی فضائل کے وہ دیوتا ہیں جس کی پرستش، چاہت اور تقلید کی ہمیشہ سے انسانوں کو ضرورت تھی اور جس کا روئے ارض پر کہیں وجود نہیں تھا... ان عظیم دیو مالائی نمونوں کو کسی کمزوری کا احساس نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں اپنی کامیابی و کامرانی کے لئے کسی مصلحت یا منفعت جوئی کو گلے لگا کر اپنے آپ کو ملوث نہیں کرنا چاہیے۔ علیؑ.... ایک مثالی نمونہ ہے۔ رہبر نہیں رہنما ہے۔ امام مبین ہے۔ ہر قوم کا رہبر "امام مبین" نہیں ہوتا بلکہ امام مبین وہ رہبر ہے جو میری رہبری کر کے مجھے ایک طرف لے جانے میں کبھی شکست سے دوچار نہیں ہوتا۔ مطلق بلند پایہ نمونے کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اس طرح کے ضعف سے سمجھوتہ کرے اور اسے برداشت کرتا رہے، اور اس موقع پر ہم دیکھتے ہیں کہ

Ali by Himself & Alone

ڈاکٹر علی شریعتی

علیؑ اور تنہائی

مترجم: سید محمد موسیٰ رضوی

، علیؑ کس طرح ایک خدائے سخن ہیں ان کی گفتگو کتنی کھری، صاف، خوبصورت اور بے عیب و ریب ہے۔ علیؑ مجموعۂ کُل صفات ہیں۔ آپ جنگ میں شجاعت، شہامت، دلاوری اور سبقت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ تاریخ کے صفحات پر انسان کے فرضی تخیل سے متعلق دیومالائی داستانوں کی حد میں آپ کی ذات پاکیزگی رُوح کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ آپ محبت، رقیق القلبی اور لطافت رُوح کا بے نظیر پیکر ہیں۔ اساطیری نمونوں کی حد میں محبوبیت کے اعلیٰ مظہر ہیں اور اتنے سخت اور خشک عدالت کا نمونہ ہیں کہ آپ کا پیارا بھائی "عقیل" بھی اسے برداشت کرنے سے قاصر ہے۔ صبر و تحمل کا وہ اعلیٰ نمونہ ہیں کہ جس منزل پر صبر و تحمل ایک جُرم سمجھا جاتا ہے۔ علیؑ ان تمام خوبیوں، خوبصورتیوں اور فضائل کا وہ ناقابلِ تعریف نمونہ ہیں جن کی ہمیشہ انسان کو تلاش رہی ہے اور اس تلاش میں اسے مایوسی کا مُنہ دیکھنا پڑا ہے۔ . . اور علیؑ اس معنے میں امام ہیں۔ "امام" وہ انسان ہے جسے ہونا چاہیے مگر ایسا انسان کہیں نہیں ہوتا اور اسی لئے تاریخ اور انسان نے ہمیشہ اس کی صورت گری کی ہے۔ وہ ایک ایسے امام ہیں جسے واقعی ہونا چاہیے مگر اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ . . اور تاریخ میں بس وہ اپنی مثال آپ ہے۔

اور "علیؑ" . . . . . . نہ صرف "علیؑ" امام ہیں۔ . . بلکہ یہ امتیاز بھی تاریخ میں کسی کو حاصل نہیں کہ ان کا پُورا گھرانا امام ہے یعنی وہ ایک اساطیری یا دیومالائی گھرانہ ہے، وہ گھرانہ کہ جس کا:

باپ "علیؑ" ـــ ماں "زہراؑ" ـــ بیٹا "حُسینؑ"

اور بیٹی "زینبؑ" ہے۔

علیؑ علیؑ ہے!

یا علیؑ مدد

سب سے پہلے میں خواتین و حضرات پر مشتمل اپنے اس محترم مجمع سے معذرت خواہ ہوں اس لئے کہ میں ایک ایسی جگہ کھڑا ہوں جہاں مجھے علم کے بارے میں گفتگو کرنی ہے اور مجھے اپنی بے بضاعتی، عاجزی اور بے مقدوری کا علم ہے۔ علاوہ ازیں میں کوئی مقرر یا خطیب نہیں ہوں بلکہ ایک معمولی استاد ہوں اور خواہ ناخواہ میرا اندازِ بیان کلاس میں درس دینے والے ایک استاد کا انداز ہے اور اس بنا پر شاید یہ انداز اس بھرے اور پر شکوہ مجمع کے مناسب حال نہ ہو۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ہر چیز سے زیادہ تعلیم کی ضرورت ہے۔ بلکہ تبلیغ سے پہلے معرفت اور علمی آشنائی درکار ہے۔

ہمارے بہت سے ترقی پسند لوگوں خاص طور پر ایک ہی سطح پر قائم ممالک کی غلطی یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ سائنس اور جدید ٹیکنیک سے ایک آزاد اور ترقی یافتہ قوم وجود میں آسکتی ہے، حالانکہ بصیرت، بیداری، آگاہی اور اعتقادی و آئیڈیالوجیکی فہم و دانش ہے جو قوم کو حیات و حرکت و قوت بخشتی ہے۔ ایک، ایمان اور آئیڈیالوجی سے خارج معاشرے میں سائنس اور صنعت کو داخل کرنا، بڑے میوہ دار درختوں کو نامناسب موسم اور ناموافق زمین میں دابنا ہے۔

لیکن اس کے باوجود جو چیز ہمارے اندر مفقود ہے وہ ایمان اور ایمان کی قوت نہیں بلکہ ان مسائل کے بارے میں عدم معرفت اور ان کی نادرست علمی اور منطقی شناخت ہے جن پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔

ان عظیم ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ جو ہماری تاریخ اور ہمارے معاشرے میں زیر بحث ہے وہ اسلام اور تشیع کا مسئلہ ہے جس پر ہمارا ایمان ہے، لیکن ہم اس کو صحیح طور پر نہیں پہچانتے۔ ہم ایک ایسے مذہب پر ایمان رکھتے ہیں جس کے بارے میں ہماری صحیح اور منطقی معلومات نہیں ہے اور ہم اس کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے ہیں۔ مثلاً ہم علیؑ پر ایک امام، ایک عظیم ہستی، ایک حقیقی "سپر مین" اور اس شخص کے عنوان سے جس نے ہمارے سارے احساسات، ساری تقدیسات اور ساری تجلیلات کو اپنی ذات سے مختص کر دیا ہے، ایمان رکھتے ہیں اور ہمیشہ طول تاریخ میں، بعد از اسلام ہماری قوم کو ان کی مدح و ثنا وستائش کا فخر حاصل ہے؛ مگر افسوس کہ ہم نے ابھی تک انہیں اس طرح نہیں پہچانا جس طرح پہچاننا چاہئے تھا، اس لئے کہ ہم نے زیادہ تر وقت ان کی ستائش میں گزارا ہے ان کی شناخت میں نہیں۔ لہٰذا آج ہمیں ایسی گفتگو کو زیادہ توجہ سے سننا چاہئے جو علیؑ کو ایک رہبر، ایک امام، ایک عظیم انسان اور ایک نمونہ عمل کے عنوان سے پہچنواتی ہے۔

تاریخ اسلام میں شاید ضروری اندازے کے مطابق علیؑ کی توصیف و تجلیل ہوئی ہو اس طرح کہ ہم ان کے بارے میں اشعار، مقالات، کرامات،

یا لکھے گئے یا پڑھے گئے مناقب، ان کے مقام کی جلالت اور خدا کی بارگاہ میں ان کی عظمت کے بارے میں عظیم الشان کتب خانے وجود میں لا سکتے ہیں لیکن افسوس کہ جب میرا کوئی طالب علم، اس زمانے، اس ملک اور علیؑ کے اس دیس میں مجھ سے پوچھتا ہے کہ "علیؑ کی پہچاننے اور ان کو سمجھنے کے لئے ہم کونسی کتاب پڑھیں اور ان کی باتوں، ان کے نظریات، اور ان کے افکار و اعمال کو سمجھنے کے لئے کن متون کی طرف رجوع کریں؟" تو میرے پاس ڈھنگ کا کوئی جواب نہیں جو میں اسے دوں۔

یہ ایک شکایت ہے جو مجھے نہ صرف معلّمین کی نمائندگی کے ضمن میں بلکہ تمام لوگوں کی نمائندگی میں، اپنے دانشمندوں سے ہے کہ:

آپ لوگوں نے علیؑ کو ان کی قوم اور ان کے ان والہ وشیدا لوگوں میں پہچنوانے کیلئے کہ جنھوں نے اپنی جان، اپنے ایمان اور اپنے لہو سے علیؑ کی راہ میں علیؑ کی خاطر جنگ کی ہے کیا کیا ہے؟ قوم اور عوام نے اس راہ میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے لیکن کوتاہی ان دانشوروں نے کی ہے جن کا فرض تھا کہ وہ علیؑ کو پہچنوائیں اور ان کا تعارف کروائیں اس طرح کہ اگر دنیا کے کسی محقق کو کسی ایسی قوم اور کسی ایسے معاشرے کی تلاش ہو جس میں وہ علیؑ کو پہچانے تو وہ معاشرہ اور وہ قوم ایران ہو اور اسی طرح اگر وہ ان کے مطالعہ کے لئے کسی کتب خانے کی طرف رجوع کرنا چاہے تو اسے قاعدتاً ہمارے کتب خانوں کی طرف آنا پڑے اور یہاں ہمارے دانشوروں کے آثار کا انتخاب کرے۔

ہماری قوم نے ہمیشہ علیؑ اور ان کے فرزندوں کی ستائش اور خراج عقیدت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ لیکن اس معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے مجھے اپنے علماء، فضلا اور دانشوروں سے پوچھنا ہے کہ:

آخر انہوں نے کیوں علیؑ کو صحیح طور پر ہمیں نہیں پہچنوایا ہے؟

"حجُر بن عدی" کی کتاب کے مقدمہ میں، میں نے ایک حقیقت لکھی تھی کہ جس کے بارے میں کہا گیا کہ: "مصلحت" نہیں ہے!

میں نے لکھا تھا کہ اگر کوئی طالب علم "بتھوون" کے بارے میں ـــ کہ جو جرمن کا ایک موسیقار ہے اور خود یورپ میں لوگ اس کی موسیقی کو پسند نہیں کرتے ـــ مطالعہ کرنا چاہے اور وہ اس سلسلے میں مجھ سے رہنمائی حاصل کرنا چاہے تو باوجود اس کے کہ اس سے آشنائی ہمارے لوگوں کے لئے چنداں ضروری نہیں اور اس کے آثار کو بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں اور لوگوں کی ایک قلیل تعداد اسے سمجھتی اور محسوس کرتی ہے ـــ مگر اس کے باوجود ـــ اس کے بارے میں کم از کم تین انتہائی خوبصورت، عمیق اور مستقل کتابیں موجود ہیں جن میں سیکڑوں تحقیقی مقالے، کانفرنس، بحث و مباحثے اور پڑھنے سے تعلق رکھنے والے علمی انٹرویوز ہیں۔

لیکن علیؑ کے بارے میں ایک کتاب بھی ہمیں ایسی نہیں ملتی کہ جس کے لئے یہ بات دعوے سے کہی جاسکے کہ وہ اس عظیم شخصیت کو کم از کم طالب علموں اور شائقینِ کتاب کی سطح پر بخوبی پہچنوائے گی۔ جو

کچھ بھی ہے وہ سب ستائش ہے اور مدح و شعر، لیکن ہم نہیں جانتے کہ جس کی ہم اتنی تعریف کررہے ہیں وہ کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے؟ یہ ہستی کہ جس نے پوری ملت کے ایمان کو ان دشوار اور سخت صدیوں میں اپنی ذات کے لئے وقف کرلیا ہے اور ہماری قوم نے برسہابرس اس کی محبت کو زندان کی سلاخوں کے پیچھے سختیاں جھیل کر اپنے دل میں ضو فگن رکھا ہے اور نسل بہ نسل اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگا کر ہمارے سپرد کیا ہے اور جس کی اتنی تجلیل ہورہی اور جس کے لئے اتنے دل دھڑک رہے ہیں اور اتنی چاہتیں اس پر نثار ہورہی ہیں، کون ہے؟

ہم نہیں جانتے!!، یہ ایک دکھ کی بات ہے: اس لئے کہ ہر شعر، ہر ستائش اور علیؑ کی ہر تعریف و تجلیل سے پہلے، حتیٰ ان کی محبت سے پہلے، ان کی معرفت ہے جو ہمارے زمانے اور ہمارے معاشرے کی ضرورت ہے۔

بے معرفت والی محبت کی کوئی حیثیت نہیں، وہ بت پرستی ہے: علی اللّٰہی والے لوگ جو ہر کسی سے زیادہ ان کی عظمت کے قائل ہیں، ان کی جلالت کے مدح خواں ہیں، ان کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں بلکہ پیغمبروں کو ان کے بھیجے ہوئے سمجھتے ہیں، آخر کیوں ان کے یہ سارے احساسات اور ان کی یہ ولایت ایک دمڑی کی نہیں۔

اس طرح کی مدحتیں، محبتیں، چاہتیں ہر قوم میں ان کے معبودوں، پیغمبروں، سورماؤں اور مقدس ہستیوں کی نسبت ہیں اور ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اہمیت ہے تو معرفت کی ہے۔

علیؑ اگر ایک رہبر ہیں ایک امام ہیں ایک نجات دہندہ ہیں اور ان کا مکتب اگر کسی قوم کی روح ہے، اگر وہ کسی قوم کی راہ ہیں اور اگر وہ کمال انسان اور مقصد حیات کے بتانے والے ہیں تو یہ ان کے مکتب کی آشنائی اور ان کی شخصیت کی شناخت میں ہے، صرف اس محبت میں نہیں جو معرفت سے خالی ہے؛ اس لئے کہ اگر معرفت کے بغیر صرف محبت سے کچھ حاصل ہوتا تو آج ہم بڑے اونچے نتائج تک پہنچ گئے ہوتے۔ کیونکہ یہ بات ممکن نہیں کہ کوئی قوم اور کوئی ملت، علیؑ کو سمجھے اور انہیں اچھی طرح پہچانے اور پھر ان سخت ترین اور معذب ترین محرومیتوں کا شکار ہو جن میں پسماندہ قومیں مبتلا ہیں۔

"اگر ہم کسی ایسے شخص کو دیکھتے ہیں جو علیؑ کا پیروکار ہے، جو ان کے لئے آنسو بہاتا ہے، جس کے دل میں علیؑ کی محبت موجیں مارتی ہے اور اس کی اور اس کے قوم کی سرنوشت دردناک ہے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس نے علیؑ کو نہیں پہچانا اور تشیع کو نہیں سمجھا ہرچند کہ وہ ظاہراً شیعہ ہو۔"

علیؑ سے محبت، اگر ہم انہیں نہیں پہچانیں، تو ان تمام قوموں کی محبت کے برابر ہے جو وہ کسی دوسرے سے رکھتے ہیں۔ علیؑ اگر معلوم نہ ہو کہ وہ کون ہیں، کیا کہہ رہے ہیں، کیا چاہ رہے ہیں اور وہ تشیع کہ جس کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو کہ اس کے اصول کیا ہیں، اس کا ہدف کیا ہے، اس کی راہ کونسی ہے تو ـــــ یہ علیؑ اور یہ مذہب ـــــ انسان پر، معاشرے پر، اور زندگی پر اس کی تاثیر کے نقطہ نظر سے ہر دوسری شخصیت اور ہر دوسرے

مذہب کے مساوی ہے۔ ناشناختہ علیؑ ہر اس دوسرے انسان اور ہر اس دوسرے قومی ہیرو کی طرح ہے کہ جو مجہول یا ناشناختہ ہے؛ اس لئے کہ محبت خود آپ سے نجات دہندہ نہیں، بلکہ معرفت ہے جو انسان کو نجات کا راستہ دکھاتی ہے۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے زمانے میں اپنے امام کو پہچانیں نہ یہ کہ معرفت سے خالی محبت پر اکتفا کریں۔ تاہم میرا یہ مقصد نہیں کہ میں امام کی محبت پر تنقید کروں بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی علیؑ کو سمجھے اور انہیں ٹوٹ کر نہ چاہے اور ان کی تعریف و توصیف نہ کرے؟ لیکن یہ محبت، علیؑ کو سمجھنے، ایک عظیم روح کی زیبائیوں سے آشنا ہونے اور ایک اعلیٰ صفات والے انسان کی پاکیزگی اور عظمت سے آگاہی حاصل کرنے کے سبب حاصل ہوتی ہے۔ اس معرفت سے حاصل ہونے والی محبت حقیقی طور پر نجات دہندہ اور قوم کی روح زندگی ہے۔ نہ وہ محبت کہ جو تلقین و توصیف و تجلیل اور خوبصورت شاعرانہ اور ادبی جملوں کے ساتھ نسل در نسل بچپن سے ہمارے دلوں میں جاگزیں ہوئی ہے۔ اس محبت کا کوئی نتیجہ نہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ علیؑ اس طرح کی محبتوں کو سراہیں، اور اس طرح کے عاشقوں کا استقبال کریں۔ علیؑ وہ ہیں کہ جنہوں نے اپنے اس افسر کے جواب میں کہ جس نے انتہائی خوبصورت عبارات سے ان کی تعریف کی، صاف الفاظ میں کہا: "میں اس بات سے برتر ہوں جو تمہارے دل میں ہے اور اس سے کمتر ہوں جو تمہاری زبان پر ہے"! علیؑ وہ ہیں کہ جنہوں نے بہ نقلِ

"ملل و نحل" اپنی پرستش کرنے والوں کو آگ میں جھونک دیا اور ان کے پیشوا کو اپنی حکومت کے حدود سے باہر نکال دیا۔

ایک معمولی انسان کا بھی یہی حال ہے وہ بھی ایسے آدمی کو زیادہ چاہتا ہے جو اس سے اچھی طرح واقف ہو، نہ وہ کہ جو اس کو جانے بغیر اس کی تعریف کرے۔

شاید بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ علیؑ کی محبت آخرت میں شفاعت کا باعث ہوگی؛ لیکن میرا خیال ہے کہ جہل سے متصل محبت، آخرت میں بھی کام نہیں آئے گی، اس لئے کہ آخرت، اسی دنیا کے منطقی اور معقول قوانین سے بنائی گئی ہے، آخرت اسی عقل و ارادہ کی تخلیق ہے جس نے یہ دنیا بنائی ہے؛ جس طرح یہاں جہل سے ابھرنے والی محبت کارآمد نہیں اسی طرح اُس دنیا میں بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

☆☆☆

یہاں چند راتوں میں میرا جو پروگرام ہے اس میں میں دو موضوعات پر گفتگو کرونگا:

۱۔ علیؑ اور تنہائی

۲۔ شکست میں کامیابی

ہم ہمیشہ جیت کو کامیابی میں دیکھتے اور سمجھتے ہیں مگر علیؑ نے ایک بہت بڑا درس ہمیں دیا ہے اور وہ شکست میں کامیابی ہے۔

کس طرح ایک امام، ایک رہبر، ایک قائد نوعِ بشر کبھی کامیاب و

کامران ہو کر اور کبھی شکست کو گلے لگا کر درس دیتا ہے کبھی زبان سے نصیحت کرتا ہے اور کبھی خاموشی سے؟

حضرت امیرؑ کے بارے میں جو مقالہ میں نے تحریر کیا تھا اس میں اشارتاً میں نے کہا تھا کہ نہج البلاغہ قرآن کے بعد ہماری وہ سب سے بڑی کتاب ہے جس کا ہم مطالعہ نہیں کرتے، جسے ہم نہیں جانتے نہیں پہچانتے؛ اور بالکل یہی حال قرآن کا ہے۔ قرآن کی بھی ہم ستائش کرتے ہیں۔ اسے چومتے ہیں اور تبرک سمجھتے ہیں۔

ہم اس قدر تعریف و تجلیل و توصیف کرتے ہیں، لیکن کیا فائدہ، یہ ہمیں کیا فائدہ پہنچائے گی جب ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس کے اندر کیا ہے اور وہ کیا بول رہا ہے؟

اور یہی صورت ان عظیم شخصیتوں کی ہے جو ہماری قوم، ہمارے معاشرے اور ہماری آئندہ نسلوں کے نجات دہندہ بن سکتے ہیں۔

میں نے اپنے اس مقالہ میں لکھا تھا کہ نہج البلاغہ بیشتر دانشمندوں، لکھنے والوں، ادیبوں حتیٰ غیر شیعی عرب معاصرین کے نزدیک عرب کا انتہائی خوبصورت ترین متن ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں کہ جو ادبی نقطہ نظر سے اوجِ زیبائی پر ہیں، فکری نقطہ نظر سے گہرائی اور گیرائی لئے ہوئے ہیں اور اخلاقی نقطہ نظر سے دستور عمل اور مثالی نمونہ ہیں۔ اس میں ایسی عبارتیں ہیں کہ جس کو پڑھ کر ہر کوئی اقرار کرتا ہے کہ بشریت میں اس طرح کی عبارتیں اور کہیں نہیں ملتیں۔ یہ علیؑ کی گفتگو اور علیؑ کے عبارات ہیں۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ علیؑ نے اپنی حیات کے پورے عرصے میں جو باتیں کہی ہیں ان میں ایک جملہ سب سے زیادہ رساتر، زیباتر، موثرتر اور سبق آموزتر ہے اور وہ :

"علی کی ۲۵ سال خاموشی ہے"،

......اور یہ سارا انسانوں سے خطاب ہے، ان انسانوں سے جو علیؑ کو پہچانتے ہیں۔ ۲۵ سال خاموشی، انتہائی سختی اور آزردگی میں ایک انسان کے لئے، وہ بھی ایک راہب اور گوشہ گیر انسان کے لئے نہیں، ایک سرگرم سماجی انسان کے لئے۔

اس بنا پر امام کبھی بول کر بات کرتا ہے اور کبھی خاموش ہو کر، کبھی اپنی کامیابی سے درس دیتا ہے اور کبھی ناکامی سے۔

ان کا خطاب ہم سے ہے اور ہماری ذمہ داری نیز آشکار ہے :

......ان دروس کو سمجھنا

......ان باتوں کو پڑھنا

......اور ان خاموشیوں کو سننا

وہ مسئلہ جس کا بیان یہاں ضروری ہے، عوام فریبی کا مرض ہے جس سے بعض اوقات، بعض مکاتب یا بعض ادیان دوچار ہوتے ہیں۔

انشٹائن کا فلسفہ کبھی عوام فریبی سے دوچار نہیں ہوتا اس لئے کہ یہ وہ موضوع ہے کہ جس سے صرف ریاضی اور فزکس سے تعلق رکھنے والے ماہرین کا سروکار ہوتا ہے اور چونکہ ریاضی اور فزکس کے متخصصین

(ماہرین) انشٹائن کی زبان کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اس لئے وہ اس کو مسخ نہیں کر سکتے، اسے بدل نہیں سکتے، اس کی تحریف نہیں کر سکتے۔

اس اعتبار سے اس طرح کے مکاتب اور فلسفے ہمیشہ عوام فریبی کی بیماری سے دور ہیں، اور یہ، ان متخصصین کے درمیان جو ان کے فہم و درک کی سطح پر ہوتے ہیں محصور و محفوظ رہتے ہیں۔ لیکن دوسری طرح کے ایسے علمی اور سماجی مکاتب اور مذاہب جن کا خطاب عوام سے ہوتا ہے وہ عوام فریبی کی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس بیماری کے آثار میں سے ایک اثر، مکتب کے حقیقی اور واقعی مفہوم کو بگاڑ کر پیش کرنا ہے۔

عوام فریبی وہ بیماری ہے کہ جو کسی فکر کی حقیقت یا کسی انسان کی گفتگو کو دگرگوں کرتی ہے، اپنی محدود فکر کے قالب میں ڈھالتی ہے اور اس کو اپنی روایتوں، عادتوں، سلیقوں اور تربیتوں کا رنگ دے کر کچھ سے کچھ کر دیتی ہے۔ "اسلام اپنی پوستین کو برعکس اور الٹا پہنتا ہے" کا یہی مفہوم ہے۔

عوام فریبی کی بیماری کو سمجھنے کے لئے بطور مثال جو بات پیش کی جا سکتی ہے وہ اکتساب ہے جو ہمارے مذہب کے بڑے آدمیوں اور ممتاز شخصیتوں کے بارے میں ہوتا ہے۔ ہم کسی انسان کے حقیقی اقدار کو درک نہیں کرتے، مثلاً ہمیں معلوم نہیں کہ علیؑ کیوں عظیم ہیں۔ بس یہ معلوم ہے کہ عظیم ہیں، جانتے ہیں کہ وہ عظمت کے حامل ہیں، جانتے ہیں کہ ہم سے زیادہ بلند تر اور متعالی تر ہیں لہٰذا ان کی ستائش کرتے ہیں اور ان سے

قلبی رشتہ جوڑتے ہیں۔

لیکن کیوں عظیم ہیں؟ ان میں کیسی فضیلتیں اور کیسی بزرگیاں ہیں؟ ہمیں نہیں معلوم۔ ہم ان کو ان معیاروں پر نہیں پرکھتے جن کو خود علیؑ اور ان کے مکتب نے ہمیں دیا ہے اس لئے کہ ہم ان معیاروں سے واقف ہی نہیں۔

ہم اپنی روایات اور اس روح کی بنیاد پر جو ہمارے معاشرے میں نسل در نسل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے، علیؑ اور ان کے مکتب کو پہچانتے ہیں۔ ہم ان کے سارے فضائل کو ان کے کرامات، ان کے معجزات اور ان کے غیر معمولی کاموں میں منحصر کرتے ہیں۔ اور صرف معجزات اور کرامات کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ مثلاً شیر خوارگی کے دور میں ایک اژدھا شہر میں داخل ہو کر لوگوں پر حملہ کرتا ہے اور علیؑ اپنے اطراف کسی ہوئی چادر (قنداق) سے ہاتھ نکال کر اس کا منہ چیر دیتے ہیں! لہٰذا علیؑ ایک بڑی ہستی ہیں۔ میں نہیں کہنا چاہتا کہ ایسا کچھ ہے بھی کہ نہیں؛ لیکن آپ کہتے ہیں کہ علیؑ امام ہیں۔ یعنی اگر میں ان کی پیروی کرونگا تو نجات پاؤنگا؛ آپ کہتے ہیں وہ رہبر ہیں، یعنی ہماری قوم اگر علیؑ کی پیچھے چلے تو وہ ایک آزاد، متمدن اور ترقی یافتہ قوم ہوگی۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ میں، ایک ایسے شخص کی پیروی کروں جس نے "قنداق" سے ہاتھ باہر نکال کر اژدھے کے دو ٹکڑے کردیئے، اور نجات پاؤں یہ کیسے ممکن ہے کہ ہماری قوم اس شخص کی پیروی کرے جس نے ایسا محیر العقول کارنامہ انجام دیا اور وہ

متمدن ہو جائے؟ آخر کس طرح؟ یہ میری سمجھ سے باہر ہے!!

بالفرض کہ علیؑ نے ہر روز کوئی نہ کوئی معجزہ دکھایا ہو میں کیا کہہ کر علیؑ اور علیؑ کے مذہب کی پیروی سے استفادہ کروں اور کس طرح میری قوم ترقی پذیر قوم ہو کر آگے بڑھے گی؟

ایسا کیوں کیا جاتا ہے؟ اس لئے کہ ہزاروں سال پہلے سے انسان کا مذہبی نقطہ نظر ایسا رہا ہے کہ یہ خاکی دنیا جس میں ہم بس رہے ہیں پست ہے، نیچے ہے، سب سے نیچے؛ اس دنیا کے بعد مختلف افلاک ہیں کہ جو زمین سے بالاتر ہیں؛ یہ افلاک جس قدر آسمان کی سمت بالاتر ہوتے جاتے ہیں، عالی تر، برتر اور متعالی تر ہوتے جاتے ہیں یہاں سے گزر کر فرشتوں کا عالم آتا ہے جو زمین سے بالاتر اور انسان سے بالاتر ہے؛ فرشتوں سے گزر کر خداؤں یا خدا کا عالم آتا ہے۔ یہ وہ سلسلہ مُراتب ہے جس کے ہم اور سارے مذاہب، ایک طویل عرصے سے قائل ہیں اور اس میں انسانی اور مافوق انسانی عظیم قدروں کی فکر شامل ہے۔

اس بنا پر انسان کی بصیرت پست ترین مرحلہ میں واقع ہے، اس کے بعد فرشتے ہیں اور پھر دیوی دیوتا یا خدا۔ جب یہ طرز فکر اسلام میں داخل ہوتا ہے تو وہ علیؑ کی اور اسلام کی بالکل الٹ شناخت کراتا ہے اور چونکہ ہم اس مذہب اور اس دین کی بنیاد رکھنے والوں اور مفکروں کو اس غیر اسلامی طرز فکر پر پرکھتے ان کا تجزیہ کرتے اور پھر پوجتے اور ستائش کرتے ہیں اس لئے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرتے۔

میرے ایک محترم استاد جناب "گورویچ" کہ جو ایک نامور ماہر عمرانیات ہیں کہتے تھے:

"میں نے عمرانیات میں ستر سال اسٹرکچرازم (Structuralism) نامی مکتب سے جنگ کی، اور پھر جب میں نے لاروس کی کتاب کو اٹھا کر دیکھا جس میں اس نے میرے حالات درج کیے تھے تو اس میں لکھا تھا: "جناب گورویچ، معاشرتی علوم (سوشیالوجی) میں اسٹرکچرازم کے سب سے بڑے بانی ہیں!"

یہ میرے کام کا نتیجہ ہے! اس کے بعد پھر اس کے نیچے گورویچ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کہ وہ دنیا کا ایک فطین انسان اور سماجی علوم کا انتہائی عظیم اور ماہر آدمی ہے، سب بیکار اور بے فائدہ ہے۔

اسلام کے اندر، انسان کی خلقت کے فلسفے میں، ہم دیکھتے ہیں، کہ خداوند عالم اتنے بیّن طریقے سے بزم گاہ امتحان میں اپنی امانت کو زمین پر، پہاڑوں پر، فرشتوں پر، حتیٰ کہ مقرب بارگاہ فرشتوں پر پیش کرتا ہے، سب اس کو اٹھانے سے انکاری ہوتے ہیں مگر انسان اس کو اٹھا لیتا ہے۔ خداوند عالم حکم دیتا ہے کہ سارے فرشتے حتیٰ عالی رتبے والے فرشتے زمین پر گر پڑیں اور آدم کو سجدہ کریں۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ اسلام میں، انسان فرشتہ سے اعلیٰ تر ہے اور آدم کا مقام، بشریت کا مقام، انسانیت کا مقام، فرشتوں سے بلکہ مقرب فرشتوں سے بھی اعلیٰ اور ارفع ہے۔

اس بنا پر اگر ہم اسلامی انداز سے سوچنا چاہیں اور علیؑ کے بارے میں

ایک ایسے مسلمان کی حیثیت سے کہ جو اپنے امام کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہے، گفتگو کرنا چاہیں یا ایک اسلامی فکر، علیؑ کے بارے میں کچھ کہنا چاہے تو خودبخود ہمارا رخ علیؑ کے ان فضائل کی طرف ہوگا جو ہر بلند پایہ انسان کا مطمع نظر ہے ہماری آنکھیں اس انسان کو دیکھیں گی جو مسجود ملائکہ ہے اور ملائکہ سے مقرب تر، بالاتر اور برتر ہے۔

لیکن ہمیں یہ ادراک نہیں ہے۔ یہ بصیرت ابھی ہمیں چھو کر بھی نہیں گئی ہے، اس لئے کہ جب ہم اپنے امام، اپنے رسولؐ اور اپنی پاکیزہ ہستیوں کی بہت اونچی سطح پر ستائش کرنا چاہتے ہیں تو انہیں فرشتوں کی صفات سے منسوب کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ اگر ہم امام کو فرشتے کے مقام تک بلند کریں گے تو ان کو انسان کے مقام سے بالاتر کردیں گے۔ حالانکہ یہ صورت ان کو اور نیچے لانے کی ہے!

اگر ہم ان تمام کرامات کو جن کا تعلق فرشتوں سے ہے اپنے ائمہ سے منسوب کریں اور یہ ثابت کریں کہ ہمارے سارے امام، اللہ کے مقرب فرشتے ہیں تو قرآن کے نقطہ نظر سے ہم ان کے مقام کو آدمی اور انسان سے گرادیں گے۔ جناب رسالتمآبؐ کی فضیلت یہ نہیں کہ ان کا سایہ نہیں تھا، اس لئے کہ سایہ، ارواح کا فرشتوں کا اور غیبی موجودات کا نہیں ہوتا۔ یہ پیغمبر اسلامؐ کی فضیلت نہیں ہے۔ اور اسی طرح بیان میں لانے والی بے مثال کارگزاریاں بھی علیؑ کی فضیلت میں شمار نہیں ہوتیں، اس لئے کہ یہ کرامتیں علیؑ کو فرشتوں کی سطح پر لاتی ہیں۔ لیکن علیؑ کا مقام ملائکہ سے

اعلیٰ اور ارفع ہے، وہ مسجود ملائکہ ہیں۔

اس بنا پر ہمیں چاہئے کہ ہم ان میں انسانی قدروں کو تلاش کریں، فرشتوں کی قدروں کو نہیں۔ لیکن چونکہ ہمارا نظریہ اسلام سے پہلے کا غیر اسلامی نظریہ ہے اور ہم اسی نگاہ سے علیؑ کو دیکھتے ہیں اسی لئے ہم نے علیؑ اور اپنے رہبروں کو فرشتہ بنادیا ہے جو انسانی معاشرے کو نجات نہیں دے سکتے۔ یہ بلند پایہ انسان ہے جو انسان کو نجات دے سکتا ہے۔ اور وہ بلند پایہ انسان علیؑ ہیں۔

لیکن علیؑ کی انسانی قدریں کونسی ہیں۔

جوبات کہ اب تک سامنے نہیں لائی گئی ہے یا شاید جس طرح لانی چاہئے، نہیں لائی گئی ہے وہ علیؑ کی تنہائی ہے۔ اور دراصل انسان ایک تنہا موجود ہے۔ تمام انسانی اساطیر میں، تمام کہانیوں میں، تمام مذاہب میں، تاریخ کے طویل دور میں انسان کی تنہائی مختلف صورتوں اور مختلف زبانوں میں بیان ہوئی ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ: "اس عالم میں انسان کا دکھ، اس کی تنہائی ہے"۔ یہ تنہائی کیوں ہے؟

"اریک فروم" کہتا ہے:

"تنہائی، بیگانگی لور عشق کی پیداوار ہے!" اور یہ سچ ہے! جو شخص ایک معبود اور ایک معشوق سے عشق کرتا ہے دیگر تمام چہروں سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور مطلوب کی آرزو کے سوا اسے اور کسی شے سے دلچسپی نہیں رہتی۔ جب مطلوب نہیں ہوتا تو وہ خود بخود تنہارہ جاتا ہے۔ اور جو

شخص، افراد، اشیاء اور اپنے اطراف کے اجزاء سے بیگانہ ہوتا ہے، ان سے مانوس نہیں ہو سکتا ان سے اس کا سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ وہ تنہارہ جاتا ہے لور اسے احساس تنہائی ہونے لگتا ہے۔ انسان جس قدر انسان ہونے کے مرحلے سے قریب تر ہوتا ہے اسی قدر اسے تنہائی کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو زیادہ گہرائی میں ہیں جو زیادہ ممتاز لور زیادہ والا قدر ہیں، ان چیزوں سے دکھ اٹھاتے ہیں جن سے دوسرے محظوظ ہوتے اور روز اس کی آرزو کرتے ہیں یا ایسے لوگ ہمارے سامنے آتے ہیں کہ جس قدر ان کی روح میں بلندی اور فکر میں رفعت پیدا ہوتی ہے اسی قدر وہ زمانے لور معاشرے سے دوری اختیار کرتے ہیں اور زمانے میں تنہارہ جاتے ہیں۔

اگر ہم نابغہ یا فطین لوگوں کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ ان کی ایک ایک معینہ صفت خود ان کے زمانے میں ان کی تنہائیاں ہیں۔ یہ لوگ اپنے زمانے میں ناشناختہ، اجنبی اور اپنے وطن میں بیگانہ ہیں اور ان کو، ان کے آثار کو، ان کی باتوں کو، ان کی سطح فکر کو اور ان کے ہنر کو آئندہ آنے والے لوگ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

سارے فلسفوں اور سارے مکتبوں میں انسان ایک تنہا موجود ہے اور تنہائی اسے دکھ دے رہی ہے، لور جوں جوں وہ انسان تر بن رہا ہے اور ترقی و تکامل کی منزل میں آگے بڑھ رہا ہے روزمرہ کے ان عواطف و احساسات میں اشتراک سے دور ہوتا جارہا ہے جن کی ہر کسی پر حکومت

ہے۔اور اس طرح اس کی مجہولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

انسان کو معاشرے میں تنہا کر دینے والے عوامل میں ایک عامل ان چیزوں سے بیگانہ ہونا ہے جن کو عام طور پر لوگ پسند کرتے ہیں، ان چشموں کے کنارے پیاسا رہنا ہے جن سے لوگ مزے لیکر پانی پیتے ہیں اور اس دستر خوان پر بھوکا رہنا ہے جس پر سب لوگ سیر ہو کر کھاتے ہیں۔ روح جس قدر متکامل تر ہوتی ہے اور اس بلند پایہ انسان تک پہنچتی ہے جسے قرآن آدم کے قصے سے یاد کرتا ہے، تنہا تر ہو جاتی ہے۔

کون تنہا نہیں؟ وہ جو سب کے ساتھ ہے، یعنی ہر کسی کی سطح پر ہے۔ جو اپنے اوپر زمانے کا رنگ چڑھالیتا ہے۔ سب کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ سب کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے، اور موجودات کی سطح پر، موجودہ حالات کے ساتھ خواہ وہ کوئی صورت اور کوئی جہت لئے ہوئے ہو، مطابق آئیوالا ہے۔

ایسا انسان، تنہائی، اکیلے پن اور اجنبیت کا احساس نہیں کرتا اس لئے کہ وہ جملہ لوگوں کی جنس سے ہے۔

وہ سب میں ہے، سب کے ساتھ کھاتا، سب جیسا پہنتا، سب کو ملا کے رکھتا اور سب جیسا حظ اٹھاتا ہے۔

احساس خلاء اس روح سے متعلق ہے جس کو اس زمانے میں، اس معاشرے میں، اور اس تباہی کی طرف بڑھنے والی پستی میں موجود کوئی شے سیر نہیں کر سکتی۔

اس زمین اور اس معاشرے میں احساس تنہائی، احساس گریز اور احساس

عشق کہ جو اس گریز کا رد عمل ہے اسے اس سمت لے جاتا ہے جس کی وہ پرستش کرتا ہے اور جس کے ساتھ اس کی موافقت ہوتی ہے۔ اس جگہ لیجاتا ہے جو اس کے مناسب حال ہوتا ہے۔ اور اس کی شخصیت سے اس کی باہم نسبت ہوتی ہے۔

کسی ہستی میں احساس تنہائی اور احساس عشق، اسی مقدار سے قوی تر، شدید تر اور درد آور تر ہوتا ہے جس مقدار سے کہ وہ بلندی کے درجات طے کرتی ہے۔

انسان کا دکھ، بلند پایہ انسان کا دکھ، تنہائی اور عشق ہے۔

اور ہم دیکھتے ہیں کہ علیؑ ---- وہی علیؑ کہ جو مستقل فریاد وزاری کر رہے ہیں، جن کی خاموشی دردناک اور جن کی گفتگو درد آور ہے، وہی علیؑ کہ جنہوں نے ایک عمر شمشیر زنی کی، جنگیں لڑیں، قربانیاں دیں، اور اپنی قوت اور اپنے جہاد سے ایک معاشرہ قائم کیا اور ایک قوم کی بنیاد رکھی، ایسے وقت میں جب یہ تحریک کامیاب ہوئی، اپنے اصحاب کے مجمع میں تنہا ہیں، اور اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نصف شب کی خاموشی میں مدینہ سے باہر نکلتے ہیں اور کنویں کے گردن میں منہ ڈال کر بلند آواز سے روتے اور فریاد کرتے ہیں۔

اتنے یار و اصحاب، اتنے ہمرزم ساتھی، پیغمبرؐ کے اتنے اصحاب کے ساتھ نشست و برخاست ---- ان میں سے کسی نے علیؑ سے تفاہم پیدا نہیں کیا۔ علیؑ ان میں سے کسی کی سطح پر نہیں ہیں۔ وہ اپنی بات کہنا چاہتے

ہیں مگر کوئی کان نہیں، کوئی دل نہیں، کوئی ہم نفس نہیں۔

وہ یثرب میں، اس شہر اور اس معاشرے میں جوان کی تلوار اور ان کی گفتگو سے وجود میں آیا ہے اپنا کوئی رازداں نہیں پاتے اور نصف شب کو اطرافِ شہر کے نخلستانوں میں جاتے ہیں اور شب کے خوفناک گھپ اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھتے ہیں کہ کہیں کوئی انہیں دیکھ تو نہیں رہا ہے!

ایک انسان کا عظیم دکھ یہ ہے کہ اس کی عظمت اور اس کی شخصیت کوتاہ فکروں کے قالب میں، اور پست و پلید نگاہوں کے آگے آئے اور اس کا احساس، انتہائی تنگ، چھوٹی اور آلودہ روحوں میں قرار پائے۔ ایک ایسی روح ایک ایسی حالت میں ہمیشہ خوفزدہ ہے کہ یہ نگاہیں، یہ اذہان اور یہ افراد اس کو اپنی نگاہ سے دیکھیں گے اپنی سوچ سے سوچیں گے اور اپنے فہم سے پہچانیں گے۔

بقول کسی لکھنے والے کے: "دن میں شیر نہیں روتا"!

لومڑیوں، بھیڑیوں، اور جانوروں کے سامنے شیر نہیں روتا۔ وہ سخت ترین عذابوں کے دکھ میں اپنی عظمت، اپنے وقار اور اپنی خاموشی کو قائم رکھتا ہے لیکن صرف رات، وہ وقت ہے جب شیر روتا ہے: نصف شب کو نخلستان کی طرف قدم بڑھاتا ہے: اس وقت وہاں کوئی نہیں ہے، سب چین کی نیند سو رہے ہیں، کسی دکھ نے انہیں رات کو نہیں جگایا ہے؛ اور یہ شخص اکیلا، کہ جو اپنے آپ کو اس زمین پر تنہا پاتا ہے، اس زمین اور اس آسمان سے بیگانہ ہے، صرف اس کے فرض اور اس کی ذمہ داری نے

اسے اس شہر اور اس معاشرے سے وابستہ کر رکھا ہے جو ہمہ وقت اور ہمہ روزہ ہے۔

لیکن جب وہ اپنے میں لوٹتا ہے تو دیکھتا ہے کہ تنہا ہے۔ نخلستان کا رخ کرتا ہے لیکن ڈرتا ہے کہ کوئی اسے اس حال میں نہ دیکھے، نہ دیکھے کہ شیر رات کو رو رہا ہے۔

اور اس پر بھی یہ احتیاط اس کے پیش نظر ہے کہ اس کی فریاد کسی پلید فہم والے شخص کے کان تک نہ پہنچے اور کوئی آلودہ نگاہ اسے آلودہ نہ کرے، اپنا سر کنویں کی چار دیواری میں دے کر روتا ہے۔

یہ رونا کس بات کے لئے ہے؟

افسوس کہ یہ رونا ہر کسی کے لئے معمہ ہے، اس لئے کہ اس کے شیعوں تک کو معلوم نہیں کہ علیؑ کیوں رو رہے ہیں۔

اس لئے کہ ان کی خلافت غصب ہوئی ہے؟ اس لئے کہ فدک ان سے چھن گیا ہے؟ اس لئے کہ فلاں شخص بر سر اقتدار آیا ہے؟ اس لئے کہ وہ اپنے مقام سے......؟ اس لئے کہ......؟ اس لئے کہ......؟ واقعاً کتنی باتوں کا سلسلہ ہے!

مگر نہیں، وہ روح، ایک ایسی دنیا میں کہ جو اس سے بیگانہ ہے، ایک ایسے معاشرے میں جس میں وہ مستقل جی رہی ہے لیکن اپنے آپ کو اس معاشرے کی سطح تک اور اپنے دوستوں کے قبائلی اسلام کی سطح تک نیچے نہیں لا سکی ہے اور اپنے آپ کو ان بدبختوں، ان کششوں، ان خود

غرضیوں اور ادراک کی اس سطح کے ساتھ کہ جو اسلام کی نسبت یا ان پیغمبر کی تھی منطبق نہیں کر سکتی ہے، تنہا رہ گئی ہے......اور رو رہی ہے۔

علیؑ فلسفیوں کی گفتگو کے مطابق رو رہے ہیں، اس لئے کہ وہ ایک انسان ہیں اور اس لئے کہ تنہا ہیں۔ جو بات میں عرض کر رہا ہوں سارے مذاہب اس کے معتقد ہیں، اور "سارتر" جیسا انسان بھی کہ جو دراصل کسی مذہب اور کسی خدا کا معتقد نہیں، انسان کو ایک الگ تانے اور ایک الگ بانے کی بناوٹ سمجھتا ہے اور کہتا ہے: سارے موجودات ایک طرح سے بنائے گئے ہیں: پہلے ان کی ماہیت بنی ہے اور پھر ان کا وجود، سوائے انسان کے، کہ پہلے اس کا وجود بنا ہے اور پھر اس کی ماہیت۔

ہم دیکھتے ہیں کہ "سارتر" بھی کہ جس کا عقیدہ خدا پر نہیں ہے، معتقد ہے کہ انسان، عالم مادی سے ایک بالکل الگ عنصر اور اس سے بیگانہ ہے۔ وہ جس قدر حیوانی مرحلوں اور اس عزیزی چاہتوں سے کہ جس کو فطرت نے اس پر مسلط کیا ہے دور تر ہوتا جاتا ہے تنہا تر ہوتا جاتا ہے۔ اس کی بھوک اور اس کی پیاس بڑھتی جاتی ہے۔ اور علیؑ اسی طرح کے ایک انسانِ مطلق ہیں۔

علیؑ طول تاریخ میں وہ تنہا انسان ہیں کہ جو مختلف، بلکہ ان متضاد جہتوں میں بھی جو ہرگز کسی انسان میں یکجا نہیں ہوتیں یکتائے روزگار ہے۔ وہ ایک عام مزدور کی طرح اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کی قوت سے زمین کھود کر اس جلتی سرزمین میں بغیر ضروری آلات کے کنویں بھی کھودتا ہے اور

ایک حکیم کی طرح سوچتا بھی ہے، ایک اونچے شیدائی اور ایک اونچے عارف کی طرح عشق کی منزلیں بھی طے کرتا ہے اور ایک سورما کی طرح تلوار بھی چلاتا ہے۔ ایک سیاستداں کی طرح قیادت بھی کرتا ہے اور ایک معلم اخلاق کی طرح معاشرے کے لئے، انسانی فضائل کا مظہر اور نمونہ بھی ہے ایک باپ بھی ہے اور ایک انتہائی وفادار دوست اور نیز مثالی شوہر بھی۔

ایک ایسی سطح پر ایک ایسا انسان ظاہر ہے کہ دنیا میں تنہا ہے۔ ایسا انسان اپنے معاشرے اور اپنے ان ہمرزم دوستوں کے درمیان کہ جنھوں نے عقیدہ کی راہ میں ایک عمر کام کیا ہے، جناب رسالتمآبؐ کے ساتھ صدق دل سے تلوار چلائی ہے، جنگوں میں حصہ لیا ہے، جن کا اپنے پیغمبرؐ کے ایمان پر ایمان ہے، لیکن اسلام اور جناب رسالتمآبؐ پر اپنے ایمان، اخلاص اور اعتقاد کی بلندی پر قبیلے کو نہیں بھلایا ہے، مقام اور منصب کو جانتے بوجھتے یا نہ جانتے بوجھتے فراموش نہیں کر سکے ہیں، تنہا ہیں۔ وہ اپنے ان دوستوں کے درمیان تنہا ہیں جن کے ساتھ انھوں نے برسوں ایک فکر اور ایک راہ پر کام کیا ہے۔ علیؑ اس رشتہ کی بھینٹ چڑھ گئے جو ان کا جناب رسالتمآبؐ سے تھا، اس لئے کہ عرب کے قبائلی معاشرے میں قبیلے کے روابط، اسلام سے زیادہ مضبوط تھے۔ ابھی قوم اور معاشرہ، جانتے بوجھتے، یا نہ جانتے بوجھتے ہوئے یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ جناب رسالتمآبؐ کا تعلق بھی بنی ہاشم سے ہو اور ان کے جانشین کا بھی: ایسی حالت میں بنی تیم، بنی عدی اور بنی زہرہ کیلئے کچھ نہیں بچتا تھا اور یہ سارے بنی اور ابناء تلف ہو جاتے!

ایک مورخ اور ایک ماہر عمرانیات سمجھ سکتا ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

اس بنا پر ان اسباب میں سے ایک سبب جس کی علیؑ، بھینٹ چڑھتے ہیں اور تنہا رہ جاتے ہیں جناب رسالتمآبؐ سے ان کی رشتہ داری ہے: اگر ان کا تعلق جناب رسالتمآبؐ کے کنبے سے نہ ہوتا تو ان کی کامیابی کے چانس زیادہ تھے۔ علیؑ وہ فرد تھے کہ جن کا یثرب کے لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ لیکن جو تلواریں انہوں نے حق کے لئے چلائیں ان ہی تلواروں نے انہیں تنہا کر دیا؛ یہی وجہ ہے کہ علیؑ مدینہ میں تنہا ہیں۔

اس سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ علیؑ اپنے پیروکاروں اور اپنے والہین کے درمیان بھی تنہا ہیں۔ وہ اپنی امت میں کہ جس نے اپنے سارے عشق واحساس اور ساری ثقافت و تاریخ کو علیؑ کے سپرد کیا ہے، تنہا ہیں۔ وہ، ان کو ایک بطل جلیل، ایک معبود اور ایک دیوتا کی طرح پوجتے ہیں لیکن اسے نہیں جانتے، نہیں جانتے کہ وہ کون ہے، اس کا دکھ کیا ہے، اس کی بات کیا ہے اس کا الم کیا ہے اور وہ چپ کیوں ہے؟

ہماری فارسی زبان میں ابھی تک کوئی ایسا نہج البلاغہ نہیں کہ جس کا لوگ مطالعہ کریں اس سے بڑھ کر تنہائی اور کیا ہے؟

تھیٹر لکھنے والوں میں "برشت" کے کم از کم پانچ آثار وہ ہیں کہ جن کا بہترین فارسی میں ترجمہ ہوا ہے۔ معمولی لوگوں کی کتابیں ساری دنیا میں بہترین نثر اور بہترین اشاعت کے ساتھ بازاروں میں آئی ہے۔ لیکن صدیاں گزرنے کے بعد بھی ابھی تک علیؑ کی باتیں فارسی زبان میں اس طرح نہیں آئی ہیں کہ ہماری نسل اسے پڑھے اور سمجھے۔ ابھی وہ قوم کہ جس نے اپنی ساری ہستی کو علیؑ کی والہانہ چاہت پر وار دیا ہے ان کے کسی جملے اور

کسی بات کو صحیح طور پر نہیں سمجھتی ہے۔

اسی لئے علیؑ اپنے پیروکاروں کے درمیان تنہا ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ علیؑ، ان تعریفوں کی بلندی پر جو ان کے لئے کی جاتی ہیں، مجہول و ناشناختہ رہ گئے ہیں۔

علیؑ کے دکھ دو طرح کے ہیں: ایک دکھ وہ ہے جسے وہ ابن ملجم کی تلوار کے زخم سے اپنے فرق سر پر محسوس کرتے ہیں اور ایک دکھ وہ ہے جو انہیں نصف شب کی خاموشی میں تن تنہا، مدینہ کے اطراف کے نخلستانوں میں کھینچ لاتی ہے، جہاں وہ کنویں میں سر دے کر روتے اور فریاد کرتے ہیں۔ ہم صرف اس درد کو روتے ہیں جسے وہ ابن ملجم کی تلوار سے اپنے فرق شگافتہ میں محسوس کرتے ہیں۔

لیکن علیؑ کا دکھ اور علیؑ کا درد یہ نہیں،

جس دکھ نے علیؑ کی عظیم ہستی کو اسقدر آزردہ کیا ہے وہ ان کی "تنہائی" ہے جس کو ہم نہیں پہچانتے۔

ہمیں چاہئے کہ ہم اس دکھ کو پہچانیں؛ اُس دکھ کو نہیں؛
اس لئے کہ علیؑ شمشیر کے درد کو محسوس نہیں کرتے۔
اور...... ہم
علیؑ کے درد کو محسوس نہیں کرتے۔

❁❁❁❁❁

ڈاکٹر علی شریعتی

What need is there for Ali?

علیؑ کی ضرورت۔ کیوں اور کس لئے؟

مترجم سید محمد موسیٰ رضوی

افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس عظیم اور احترام والی رات کو میری حالت اس بات کی اجازت نہیں دے رہی ہے کہ میں اس شاندار مجمع میں علیؑ کی شخصیت پر گفتگو کروں لہٰذا میں اپنی تقریر کو ایک سوال کے ضمن میں آغاز کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ: "آج ہمیں علیؑ کی ضرورت کیوں ہے؟ آج علیؑ کو پہچاننا ہمارے لئے کیوں ضروری ہے؟"

البتہ میرا خیال ہے کہ یہ سوال صرف علیؑ کے شیعوں کی طرف عنوان نہ بنے؛ اس لئے کہ علیؑ کے شیعوں کے لئے ــــ خاص طور پر اس وقت کے شیعوں کے لئے ــــ یہ سوال زیادہ اہم نہیں ہے؛ اس لئے کہ علیؑ امام ہیں، رہبر ہیں، لہٰذا انہیں پہچاننا ضروری ہے اور دراصل ہم ان کے محتاج ہیں۔

مگر اب ہم فرض کرتے ہیں کہ ہماری نوجوان نسل، ہمارے روشن خیال نوخیز اور اس دور اور اس زمانے کی روح بنیادی طور پر ہم سے ــــ یا پھر اپنے آپ سے یا ان سے جو علیؑ کا دم بھرتے ہیں ــــ یہ سوال کررہی ہے اور میں اس کا جواب دینا چاہتا ہوں؛ میرا جواب اس کے لئے نہیں جو شیعی نقطہ نظر سے علیؑ کا معتقد ہے، اس کے لئے بھی نہیں جو

مسلمان ہے، بلکہ ہر کسی کے لئے ہے، ہر جگہ کے لوگوں کیلئے ہے، وہ شیعہ ہوں کہ غیر شیعہ، مسلمان ہوں کہ غیر مسلم، مومن ہوں کہ غیر مومن؛ صرف ایک شرط کے ساتھ اور وہ یہ کہ سوال کرنے والا ایک ایسا انسان ہو کہ جس کا دل آج انسانیت کیلئے آزادی کیلئے اور انصاف کے لئے جل رہا ہو اور وہ اس اصول کا کہ جو دنیا کے سارے احرار اور روشن خیال لوگوں کے درمیان مشترک ہے، معتقد ہو: احرار، خواہ وہ دیندار ہوں کہ بے دین، جس طرح حسینؑ بن علیؑ اپنے دشمن سے کہتے ہیں کہ: "اگر تمہارا کوئی دین نہیں تو کم از کم آزاد مرد تو رہو۔"

آج میں ان تمام آزاد لوگوں سے ان سے کہ جو انسانی اقدار کے پرستار ہیں کہنا چاہتا ہوں کہ کیوں علیؑ کو پہچاننا ضروری ہے، خاص طور پر میرا روئے سخن ان آزاد انسانوں اور ان روشن خیال لوگوں سے ہے جو مشرق میں اور اسلامی معاشرے میں زندگی بسر کررہے ہیں خواہ وہ کسی مسلک اور کسی مکتب کے معتقد کیوں نہ ہوں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی کسی خاص مذہب کا معتقد بھی نہ ہو پھر بھی علیؑ کی شناخت اس کیلئے ضروری ہے اس لئے کہ آج کے انسان کو اور خاص طور پر اسلامی معاشرے کے ایک فرض شناس روشن خیال شخص کو علیؑ کی پہچان کی ہر صدی سے زیادہ ضرورت ہے۔ بالکل روشن خیال لوگوں کے اس فکر کے برخلاف جس میں وہ سمجھتے ہیں کہ علیؑ ایک عظیم تاریخی شخصیت ہے گزشتہ سے متعلق، اور آج انسان کی ضرورتوں، انسان کے احساس، اور انسان کے اہداف میں تبدیلی آگئی ہے،

اس بنا پر گزشتہ دور کے چہرہ کو آج کی انقلاب یافتہ دنیا میں پیش کرنا ایک بے سود و بے ثمر کام ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بشریت کو اور خاص طور سے اسلامی معاشرے میں پھنسے ہوئے روشن خیال طبقے کو علیؑ نامی انسان کی جتنی آج ضرورت ہے اس سے پہلے کبھی نہیں رہی۔

میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ آج کے انسان کو علیؑ کی شناخت کی ضرورت ہے اس کی نسبت عشق و محبت کی نہیں۔ اس لئے کہ عشق و محبت، شناخت کے بغیر نہ صرف کسی اہمیت کی حامل نہیں بلکہ، اپنے میں مشغول کرنے والی، ہر شے سے بے خبر کرنے والی اور انسان کو معطل کرنے والی بھی ہے۔

وہ لوگ کہ جو، مولا، ان کے ارشادات، ان کی راہ اور ان کے ہدف کو دقیق اور صحیح مفہوم کے ساتھ سمجھے بغیر علیؑ کی محبت اور عشقِ مولا کے نام سے لوگوں کو ناکارہ اور سرگرداں کرتے ہیں نہ صرف انسانیت، آزادی اور انصاف کا گلا گھونٹتے ہیں بلکہ خود اِن محترم اور معزز چہروں کو بھی بگاڑ دیتے ہیں اور علیؑ کی اپنی شخصیت کو اپنے ان تجزیوں تلے مجہول اور ناشناختہ رکھتے ہیں، اور اس بات کا باعث بنتے ہیں کہ ان لوگوں کو کہ جو اپنی عمر کے آخری حصے تک مولا کی محبت میں وفادار رہتے ہیں آپ کی رہنمائیوں اور آپ کی باتوں سے بے بہرہ کردیں اور ان کے آگے بڑھنے کی راہ روک دیں اور اس طرح ان لوگوں کو بھی کہ جن میں کسی قدر بیداری پیدا ہوئی ہے اور انہوں نے آج کی دنیا سے واقفیت حاصل کرلی ہے مجبور کریں کہ وہ اس

طرح کے لاحاصل علم اور اس نتیجہ سے خالی محبت کو چھوڑ کر دوسری شخصیتوں، دوسرے مثالی نمونوں اور دوسرے رہبروں کے پیچھے جائیں۔

علیؑ سے عشق و محبت ان کی شناخت کے بعد ہے کہ جو انسانیت کی نجات کے عامل کے عنوان سے اپنا کردار ادا کرسکتی ہے۔ گو کہ پھر کچھ لوگ یہ بات پھیلائیں گے کہ "فلاں کہتا ہے کہ علیؑ سے عشق اور مولا سے محبت کا کوئی فائدہ نہیں ہے" اور میری گفتگو کے باقی حصے کو کاٹ دیں گے۔ جیسا کہ میں نے کسی کتاب میں لکھا تھا کہ: اگر علیؑ نہیں ہوتے اور علیؑ کی حکومت نہیں ہوتی تو حضرات ابوبکر و عمر کی سیاسی اور سماجی حکومت ـــ خسروں اور قیصروں کی حکومتوں کے مقابلے میں ـــ تاریخ کی بہترین حکومت سمجھی جاتی۔ لیکن یہ کہ یہ حکومتیں بالا سطح کی نہیں ہیں اس لئے کہ ہم ان کی حکومتوں کو علیؑ کی حکومت سے اور خود ان کو علیؑ کی شخصیت سے جانچتے ہیں اور پھر صحیح طور پر فیصلہ کرتے ہیں۔ ـــ یہ وہ بات تھی جسے میں نے لکھا ـــ بعد میں، میں نے سنا کہ بعض محافل میں یہ بات کہی گئی کہ: "فلاں کہتا ہے کہ ابوبکر و عمر کی حکومتیں دنیا کی ساری حکومتوں سے بہتر ہیں"۔ اور پھر وہاں موجود لوگوں نے کہا: "خدا اس پر لعنت کرے کہ اس نے ایسی بات کہی ہے!"

معلوم نہیں کہ یہ لوگ کیوں ان عام افراد سے گفتگو کرتے ہیں کہ جو علمی مسائل سے واقف نہیں اور ان لوگوں کو ابھارتے ہیں کہ جو قوی جذبات کے حامل ہیں۔ یہ ایک علمی بحث ہے؛ اگر میں غلط کہہ رہا ہوں تو ہونا یہ

چاہئے کہ کسی علمی تنقید اور مباحثہ میں اس کی تصحیح کی جائے۔

"اسلام شناسی" نامی کتاب میں، میں نے ایک بحث چھیڑی ہے اور وہ یہ ہے کہ تاریخ، فلسفہ تاریخ اور معاشرتی علوم کی اساس چند بنیادوں پر قائم ہے:

۱۔ شخصیت اور رہبر، ۲۔ ناس یعنی عوام الناس، ۳۔ سنت یعنی قانونِ سماج اور قانونِ تاریخ، ۴۔ حادثہ یا واقعہ یعنی پیش آنے والے اجتماعی شرائط خود سے دوسرے علمی قوانین کو جنم دیتے ہیں؛ اور یہ وہ چار عوامل ہیں کہ جو تاریخ کو حرکت دیتے ہیں اور سماجی حرکات کی تفسیر کرتے ہیں۔

یہ ایک علمی بحث ہے خواہ درست بھی نہ ہو۔

بعد میں، میں نے سنا کہ ہمارے اسی مشہد میں کسی ذاکر نے جس غریب کو کچھ لوگوں نے بھڑکا دیا تھا ایک خاص طبقے کے لوگوں میں کہا: "اے لوگو، اس کتاب میں فلاں نے لکھا ہے کہ دین، زندگی، اور سماج و تاریخ، سب کی بنیاد "ناس" پر ہے! (یہاں ناس سے اس کی مراد وہ نشہ آور پسا ہوا تمباکو ہے جسے ناک سے سونگھا جاتا ہے اور جس کا استعمال مشرقی ممالک، جنوبی ایران اور نیز افغانستان اور ہندوستان میں ہوتا ہے) اور پھر یہ بات اس نے افغانستان کے قریب رہنے والے باشندوں کے مجمع میں کہی.....!

علیؑ کو آج کی بشریت میں پہچنوانے والے عظیم انسان، ڈاکٹر جورج جرداق "الامام علیؑ صوت العدالت الانسانیہ" نامی کتاب

میں لکھتے ہیں: "اے جگ سنبھار، کاش تو اپنی ساری طاقتوں کو اور اے فطرت واصلِ خلقت کاش تو اپنی ساری صلاحیتوں کو ایک عظیم انسان، ایک عظیم فطانت اور ایک عظیم بطل جلیل کی پیدائش میں بروئے کار لاکر ایک بار پھر دنیا کو ایک اور علیؑ دے سکتا"۔

اس کتاب کا لکھنے والا ایک عیسائی طبیب ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علیؑ کسی ایک فرقے کے فریم میں پرکھے نہیں جاتے بلکہ ہر وہ انسان جو انسانی مفاہیم پر یقین رکھتا ہے علیؑ کا معتقد ہے، اور ہر وہ دور اور ہر وہ تحریک جو ان قدروں کی معتقد ہے اور ان اہداف کے حصول کے لئے لڑ بھڑ رہی ہے اس کے لئے علیؑ کی شناخت ضروری ہے، اور یقیناً جب وہ انہیں پہچان لے گی تو ان سے اس کا دلی لگاؤ بھی ہوگا۔ اور یہ دلی لگاؤ انسان کو ابھارنے اور اسے نجات سے ہمکنار کرنے کے لئے ایک بڑی قوت اور ایک بڑی قدرت ثابت ہوگی۔

میرا خیال ہے کہ علیؑ کی شرحِ زندگی کو تین الگ الگ ادوار میں بانٹا اور بیان کیا جاسکتا ہے۔ البتہ آپ کے بچپنے کا دور اس سے مستثنیٰ ہے، اس لئے کہ یہ دور باوجود اس کے کہ شخصیت کی تکوین کے لئے بہت اہم ہے، لیکن انسان کے معاشرتی کردار کے نقطہ نظر سے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

علیؑ کی زندگی تین مختلف ادوار اور تین بالکل ہی الگ ابواب سے تشکیل پاتی ہے۔

پہلا دور جناب رسالتمآبؐ کی بعثت سے شروع ہوتا ہے۔ علیؑ شروع

بعثت سے جناب رسالتمآبؐ کے ہمنوا اور شریک کار رہے ہیں اور رسول خداؐ کے آخری دم تک آپ کے ساتھ ان کی ھمنوائی برقرار رہی ہے۔ جناب رسالتمآبؐ نے علیؑ کے دامن میں اپنا دور حیات ختم کیا، ان ہی کے گھر میں زندگی بسر کی اور جب پہلی وحی آئی تو اسے فوراً قبول کیا۔ یہ دور ۲۳ سال کا ہے۔ (تیرہ سال مکہ میں اور دس سال مدینے میں) مکہ کے ۱۳ سال میں اسلام نے، فرد کی تعمیر، اپنے مذہب کے نصب العین کے اعلان اور فکری نقطہ نظر سے اپنے ہدف کے استقرار کیلئے جنگ کی ہے۔

یہ بحث ابھی تک جاری ہے کہ کسی تحریک میں ایک اچھے معاشرے کو جنم دینے کے لئے کیا پہلے، افراد کی تربیت اور لوگوں کی اصلاح ضروری ہے یا شروع ہی سے ایک اچھے معاشرہ کا قیام عمل میں آئے۔ تاکہ اس میں باکردار لوگ موجود ہوں؟ بنیادی طور پر یہ بحث دونوں صورتوں میں غلط ہے اس لئے کہ برے اور غیر صالح افراد کے ساتھ کس طرح ایک اچھے اور صالح معاشرے کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے؟ اور پھر اگر ہم چاہیں کہ سارے افراد کو نیک بنائیں تو ہمارا بگڑا ہوا معاشرہ ہمیں یہ کام کرنے نہیں دیگا اس لئے کہ عوامی قوتیں چپ کھڑی نہیں ہیں کہ ہم ان میں سے ایک ایک فرد کو انسان بناتے رہیں۔

لیکن دوسرے رخ سے یہ دونوں سوچ درست ہیں؛ یعنی ایک خاص مرحلہ میں کوئی مکتب، کوئی رہبر، کوئی پیغام لانے والا، اپنے مکتب کی بنیاد پر افراد کی اصلاح کرتا ہے؛ اس مکتب کی بنیاد پر بنے اور پرورش پانے والے

افراد ایک بااصول اور فرض شناس فکری، انقلابی اور اجتماعی گروہ کو تشکیل دیتے ہیں۔ اس مرحلہ میں فرد سازی کا دور ختم ہوجاتا ہے۔ بعد کے مرحلے میں یہ فکری، اجتماعی اور اعتقادی گروہ، معاشرے میں تبدیلی لاسکتے ہیں اور اپنی فکر کی بنیاد پر ایک نئے نظام، ایک نئے ہدف اور ایک نئی حکومت کو جنم دے سکتے ہیں اور یہ وہ وقت ہوگا کہ جب معاشرہ اپنے معاشرے کی تعمیر کا آغاز کرے گا۔

اسلام میں مکے کے تیرہ سال اور مدینے کے دس سال دو منظم ادوار ہیں۔ کسی اتفاق نے اس ہجرت کو رونما نہیں کیا۔ ۱۳ سال کا دور وہ پہلا دور ہے کہ جس میں اسلام، ایک ایک مسلمان کی، یعنی صحیح سوچ اور صحیح عقیدے والے انسان کی تعمیر کرتا ہے، اور یہ اقلیت جو مہاجرین پر مشتمل ہے مدینہ میں دوسرے مرحلہ کا آغاز کرتی ہے اور وہ مرحلہ ایک صحیح معاشرے کی تعمیر ہے۔ اس بنا پر مکتب اسلام میں مکہ، فرد سازی اور مدینہ، سماج سازی کا دور ہے۔

ان تمام برسوں، اور ان دونوں ادوار میں، بعثت کے پہلے لمحے سے، جناب رسالتمآبؐ کی رحلت تک علیؑ ہمیشہ ان کے ھمخیال و ھمگام رہے اور گھمسان کی خوفناک ترین جنگوں میں ہمیشہ انہوں نے ہر کسی سے سبقت لی۔

علیؑ کی زندگی کا یہ خاص دور، جناب رسالتمآبؐ کی رحلت کے بعد اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ دور ایک خاص عنوان کا حامل ہے اور اس کی

وابستگی مکتب سازی سے ہے۔ یعنی عوام کے ذہن میں استقرار مکتب اور قوم کی پرورش بر بنائے مکتب، یعنی زمانے کے وجدان میں ابلاغ ایمان اور احیائی مکتب اور ایک ایمانی گروہ کی تشکیل، اور ایک جملہ میں، ایک ہدف کی خاطر جنگ۔

یہ علیؑ کی زندگی کا پہلا باب ہے۔ علیؑ کی زندگی کے پہلے ۲۳ سال مکتب کی خاطر جنگ سے عبارت ہیں۔

جناب رسالتمآبؐ کی رحلت کے فوراً بعد صورتحال اور محاذ آرائی میں تبدیلی آتی ہے قیادت بدل جاتی ہے: وہ قوتیں، وہ طاقتیں اور وہ صفیں جو پارٹی کے اندر خاموش اور چھپی بیٹھی تھیں اور اس مکتب کی خاطر عمومی جنگ میں، اپنے آپ کو ظاہر نہیں کر رہی تھیں بر سر کار آگئیں، پارٹیاں مشخص ہوگئیں اور اس پارٹی کی چھپی ہوئی داخلی قوتیں ابھر کر سامنے آگئیں، اور یہیں سے علیؑ کی خاموشی کا آغاز ہوا۔ خاموشی اس مفہوم میں کہ اب وہ کچھ بول نہیں سکتے تھے، اپنی آواز بلند نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے کہ انہوں نے اچانک دیکھا کہ وہ لوگ جو ۲۳ سال ان کے ساتھ رہے۔ عکرمہ، ابوجہل اور ابوسفیان جیسے لوگ نہیں بلکہ خود ان کے اور جناب رسالتمآبؐ کے وہ نزدیک ترین اور خالص ترین اصحاب کو جو مکتب کی خاطر ۲۳ سال کے اس جنگ میں ان کے ہمگام و ہمراہ رہے اب ان کے مقابل پر آگئے ہیں۔ ان کے خلاف جنگ ان بڑی شخصیتوں کے خلاف جنگ تھی کہ جو بہر حال ان دنوں کے خصوصی شرائط کے اعتبار سے قوت، طاقت

اور اسلامی وحدت کا نشان بن گئے تھے۔

اسلام اور مسلمین کے درمیان پارٹیوں کی تشکیل، خاندانی اختلافات اور داخلی قوتوں نے ایک ایسی پیچیدہ بافت بنالی تھی کہ جس میں علیؑ کے مقابل آنے والی شخصیتیں اس بافت کی گرہ بن گئی تھیں اور اگر علیؑ ان کے خلاف تلوار اٹھاتے تو گویا ان کی تلوار ان لوگوں کے مقابل ہوتی کہ جو اگرچہ کہ ان کے حق کو پامال کرنے کے لئے اٹھے تھے، مگر ان کی نابودی یا علیؑ کا نقصان ـــ دونوں ـــ اسلام کی قوت کی مرکزیت اور اسلام کے جواں سال طاقت کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتی اور وہ طاقت جو اسلام کے نام سے مدینہ میں ابھری اور سارے منافق قبائل اور ایران و روم کی ظالم قوتوں کے سروں پر چھاگئی تھی اندر سے بکھر جاتی اور بڑی بیرونی طاقتوں کو اس کا علم ہو جاتا کہ اس تحریک کی اصلی شخصیتوں، رہبروں اور طاقتوں کے درمیان ٹھن گئی ہے اور یہ امر اس قوت اور اس مرکزیت پر دھاوے کا سب سے بڑا سبب بنتا۔

اسلام کی وحدت ان لوگوں کے ہاتھوں میں تھی کہ جنھوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے مقام کے تحفظ کے لئے بیجا فائدہ اٹھایا تھا۔ اور اسی بنا پر علیؑ کی خاموشی کا آغاز عمل میں آتا ہے۔

۲۵ سال کی خاموشی: ۲۵ سال کی یہ خاموشی وہ خاموشی ہے کہ جس کے بارے میں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ شیعوں نے بھی خاموشی اختیار کی ہے اور اہلسنت کے محققین نے بھی۔ اور یہ خاموشیاں اس بات کا

سبب بنی ہیں کہ علیؑ کی منزلت، علیؑ کی شہامت، علیؑ کا اعلیٰ ترین جلوہ، اور علیؑ کی جانبازی و حق پرستی ان کی اس خاموشی میں دب جائے اور لوگوں کے اذہان و افکار پوری طرح ان سے واقف نہ ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ حتیٰ ان کے پیروکار، مکہ میں جناب رسول خدا کے بستر پر علیؑ کے سونے کے بارے میں اسقدر تکرار و تجلیل کو فروغ دیتے ہیں --- اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بہت بڑی جانبازی ہے، مگر علیؑ کے لئے نہیں --- اور حتیٰ خیبر کا در اکھاڑ کر اس کو سپر بنانے کے عمل کو علیؑ کی بہادری اور شہادت کے سمبل کے عنوان سے بے تحاشا بیان کرتے ہیں، لیکن علیؑ کے مشکل ترین کردار اور سخت ترین دور کے بارے میں کہ جو ان کی خاموشی سے متعلق ہے کچھ نہیں کہتے اور کاش کچھ نہ کہیں اس لئے کہ جب وہ اس کے بارے میں کچھ کہتے ہیں تو بدترین تہمتوں کو اس خاموشی کی توجیہ کے لئے علیؑ کی شخصیت اور ان کی عظمت کی نسبت روا رکھتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ "یہ خاموشی ڈر کے سبب ہے! انہوں نے کیوں بیعت کی؟ اگر نہیں کرتے تو مار دیئے جاتے! انہوں نے تلوار کیوں نہیں سنبھالی؟ ڈرتے تھے! انہیں زبردستی لایا گیا اور چونکہ ان پر دباؤ تھا اس لئے انہوں نے خلافت باطل کے حق میں رائے دی!

دسویں سال کے آخر اور گیارہویں سال کے آغاز سے کہ جب مکتب کے دور کا اختتام اور اسلامی معاشرے میں نفاق اور اختلاف کا عمل رونما ہوتا ہے، علیؑ کی خاموشی شروع ہوتی ہے اور یہ خاموشی ۳۵ ویں برس تک یعنی

حضرت عثمان کے خلاف عوامی انقلاب اور ان کے مارے جانے تک، برقرار رہتی ہے ۲۵ سال خاموشی برای اتحاد۔

۳۵ ویں سال میں انقلاب لانے والے، علیؑ کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور عدل و انصاف کی خاطر --- یعنی اسی چیز کے لئے کہ جس کو انہوں نے حضرت عثمان میں نہیں پایا تھا اور ان کے خلاف قیام کیا تھا --- علیؑ کو حکومت کے لئے منتخب کرتے ہیں۔

علیؑ کی حکومت کی میعاد ۵ سال ہے۔ علیؑ کی زندگی کے اس دور کا عنوان مکتب نہیں ہے؛ اس لئے کہ تمام مومن اور منافق، سارے اسلامی دستوروں، ایمانی اصولوں اور اس مکتب کے بنیادی ستونوں کے معتقد تھے۔ سب کا، توحید، نبوت اور معاد پر ایمان تھا ہر کوئی قرآن اور رسولؐ کی رسالت پر یقین رکھتا تھا۔ پس یہ دور "مکتب کے لئے استقرار جنگ کا دور نہیں تھا" اور پھر اس دور کا عنوان "وحدت کے لئے خاموشی کا دور" بھی نہیں تھا اس لئے کہ اب علیؑ برسرکار ہیں۔ اب وہ ایک حکمران ہو گئے ہیں۔ اقلیت کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے منافق اور مصلحت پرست ہم رزم کے مقابل خاموشی اختیار کرے اور مشکلات کو برداشت کرے تاکہ بات مشترک دشمن کے فائدے میں نہ جائے۔ لیکن اب علیؑ کے ہاتھ میں حکومت ہے اب ان کی سب سے بڑی ذمہ داری وحدت نہیں، عدالت ہے۔

اس بنا پر علیؑ کی زندگی کے سارے حالات جس کے ہر ہر واقعے سے آپ سب لوگ واقف ہیں اور بارہا آپ نے انہیں سنا ہے تین ادوار میں منقسم

ہوتے ہیں:

پہلا دور استقرار مکتب کے لئے جناب رسالتمآبؐ کی معیت میں ۲۳ سال جنگ۔ دوسرا دور، اندرونی مخالف محاذوں کے مقابل وحدت کی برقراری کے لئے ۲۵ سال خاموشی۔ تیسرا دور قیام عدالت کے لئے ۵ سال حکومت۔

آپ، اسلام کے ایمانی مکتب کے استقرار کے لئے علیؑ کی ۲۳ سال کی جنگ سے واقف ہیں آپ نے جنگ کے محاذوں پر علیؑ کی پائیداری اور حملوں میں ہر کسی سے آگے ہونے نیز احد، حنین، بدر، خندق اور تمام جنگوں میں جناب رسالتمآبؐ کے احکام کے اجرا کی نسبت ان کے کردار کو سنا ہے اور ان ضربوں سے بھی واقف ہیں کہ جن کے نتیجے میں، اسلام میں داخل دشمن نے بعد کو ان کا انتقام خود علیؑ اور ان کے خاندان سے لیا۔

خندق میں ابوسفیان اور اس کی جماعت پر آپ نے ایک ایسی عجیب، ٹھیک ٹھاک اور گہری ضرب لگائی کہ جس کی جناب رسالتمآبؐ نے ان الفاظ میں قدردانی کی اور کہا: "علیؑ کی تنہا یہ ایک ضرب جن وانس کی عبادت سے افضل ہے!"

اس ضرب کی یہ قدر و قیمت بالکل درست اور منطقی ہے، اس لئے کہ دونوں جہانوں کے لوگوں کی عبادت انفرادی طور پر ہر ایک کے لئے مفید ہے، لیکن یہ وہ ضرب ہے کہ جو انسان کی سرنوشت اور ایک تحریک کی سرنوشت کو بدل دیتی ہے اور اسی لئے "جہاد والا اسلام" "دونوں جہان کی

عبادت والے اسلام" سے زیادہ افضل ہے۔

مکتب کیلئے ۲۳ سال کی جنگ کے بعد، علیؑ کی خاموشی کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں آپ بیعت نہیں کرنا چاہتے، جس میں آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے اور ان کے گھرانے کے حق کو اور اس سے بڑھ کر ان لوگوں کے حق کو کہ جو صرف انصاف اور عدالت کی خاطر اسلام لائے تھے یہ داخلی جماعتیں پامال کر رہی ہیں۔ یہ جماعتیں بڑی مضبوط اور طاقتور تھیں۔ سب سے زیادہ طاقتور جماعت جو تاریخ میں بڑی نمایاں ہے ایک چھوٹی جماعت تھی جو اگرچہ تعداد میں کم مگر کیفیت میں بہت طاقتور تھی اور اس کی قیادت حضرت ابوبکر کے ہاتھ میں تھی۔ اس گروہ یا اس جماعت کے ارکان میں سعد بن ابی وقاص، حضرت عثمان، طلحہ، زبیر اور عبدالرحمٰن بن عوف تھے۔ یہ پانچوں افراد جناب رسالتمآبؐ کی بعثت کے پہلے سال، جب اسلامؐ نے اپنے ظہور کا اعلان کیا حضرت ابوبکر کے ساتھ اسلام لائے سیرت ابن ہشام میں کہ جس میں ابتدائی مسلمانوں کو اس ترتیب سے لایا گیا ہے، جس ترتیب سے کہ وہ مسلمان ہوئے تھے اس بات کی تصریح ہے کہ حضرت ابوبکر کے حکم سے پانچ اور افراد اسلام میں داخل ہوئے اور یہ پانچ افراد جو ایک ساتھ، یکجا طور پر حضرت ابوبکر کے کہنے سے اسلام لائے یہی مذکورہ اشخاص تھے۔

۲۳ سال، اس گروہ یا اس جماعت پر گزر جاتے ہیں۔ حضرت ابوبکر کے دو سال بھی بیت جاتے ہیں، حضرت عمر کی حکومت کے دس برس بھی

اختتام کو پہنچتے ہیں۔ حضرت عمر اپنی موت کے آخری لمحے میں ایک شوریٰ تشکیل دیتے ہیں تاکہ وہ خلیفہ منتخب کرے۔ اب جب ہماری نگاہ اس شوریٰ پر پڑتی ہے کہ علیؑ کے سوا جن کو کہ ان انتخابات کی توجیہ کیلئے لایا گیا تھا باقی سب لوگ بغیر کسی کم وکاست کے یہی پانچ افراد تھے جو حضرت ابوبکر کے کہنے پر ایک ساتھ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

اس گروہ میں سے، جس میں کہ علیؑ کو زبردستی ٹھونسا گیا تھا بلاشبہ حضرت عثمان فیضیاب باہر نکلے۔ اس گروہ کا ہر فرد جب تک زندہ تھا بغیر کسی استثنا کے علیؑ کے مقابل ان کا حریف رہا، حزب اللہ اسلام میں ان سب کا یہ گروہ ہمیشہ علیؑ کی ضد پر رہا۔ یہاں تک کہ حضرت علیؑ کی خاموشی کے دور میں جب حضرت عثمان، حضرت ابوبکر اور عبدالرحمٰن بن عوف گزر گئے اور طلحہ، زبیر اور سعد باقی رہے تو طلحہ اور زبیر نے جنگ جمل میں علیؑ کے خلاف تلوار اٹھائی اور جب ان کا خاتمہ ہو گیا تو اس گروہ کے آخری فرد سعد بن ابی وقاص باقی بچے۔ یہ وہ شخصیت ہے کہ جس کا شمار اسلامی حکومت کے نامی افراد، اور تاریخ کے بڑے فاتحین میں ہوتا ہے۔ اس نے حضرت عمر کے لئے بہت تلوار چلائی اور ایران کو فتح کیا۔ حضرت عمر کے زمانے میں اسے بڑے بڑے فوجی مناصب ملے۔ علیؑ کی حکومت آئی تو اس نے کنارہ کشی اختیار کی اور احتجاجاً گھر بیٹھ گیا اور منفی مبارزہ کا آغاز کیا۔ اب اس گروہ کا یہی ایک فرد باقی بچا تھا اور باقی سب رخصت ہو گئے تھے۔ بنی امیہ اور معاویہ نے مدینہ میں ہڑبونگ مچادی تھی کہ علیؑ زور اور زبردستی سے

مدینہ کے لوگوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ ان کا انتخاب جعلی اور تلوار کی زور پر ہوا ہے، مصر اور بصرہ کے انقلابی لوگوں نے حضرت عثمان کو قتل کر کے تلوار کے زور پر علیؑ کو حکومت دی ہے۔ اس میں نہ انصار کی رائے شامل ہے اور نہ مہاجروں کی۔

بعد ازیں معاویہ کا نمائندہ مدینہ آتا ہے اور سعد سے پوچھتا ہے کہ "کیا یہ سچ ہے کہ تم لوگوں نے زور، زبردستی اور دباؤ سے علیؑ کو رائے دی ہے اور علیؑ کو حقیقت میں رائے نہیں ملی ہے؟" سعد خود بنی امیہ کے مخالفین اور دشمنوں میں سے ہے اور جناب رسالتمآبؐ کے ۲۳ سالہ دور میں جنگ کے محاذوں پر اس نے بڑی لڑائیاں لڑیں ہیں اور حضرات ابوبکر و عمر کے ادوار میں بھی اس نے اسلام کے مفاد میں تلوار چلائی ہے اور وہ اسلام کی ایک بڑی اور نامی شخصیت ہے، لیکن چونکہ وہ علیؑ کی حریف پارٹی کا شمار ہ جانے والا رکن ہے اگر صحیح جواب دیتا ہے تو یہ بات علیؑ کے مفاد اور اپنے مشترک دشمن معاویہ کے نقصان میں جاتی ہے، اس لئے وہ جواب کے بجائے خاموشی اختیار کرتا ہے، وہ خاموشی جو ہر تصریح سے بدتر ہے، وہ خاموشی جو علیؑ اور اسلام کے نقصان اور ان کے مشترک دشمن کے فائدے میں ہے۔ لیکن ذاتی انتقامی جذبہ، پارٹی بازی اور مفاد پرستی انسان کو اس منزل پر لے آتی ہے کہ اسلام کا عظیم فاتح سعد بن ابی وقاص، وہ کہ جس کی اسلامی قوت واقتدار کے لئے اتنی خدمات ہیں، جس نے جناب رسالتمآبؐ کے زمانے میں اتنی کامیاب تلوار چلائی ہے، علیؑ کے خلاف، اسلام کے

مشترک دشمن کا آلہ کار بن جاتا ہے۔

یہ وہ مسائل ہیں جو ہمیشہ رہنے والے ہیں اور یہ بات کتنی باعث تکلیف ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ صحیح، سالم اور ستھرے لوگ مفاد پرستی کی خاطر اس شخص کی نسبت جس کے ساتھ وہ ہم عقیدہ ہیں اپنے مشترک دشمن کے اعزازی معاون اور آلہ کار بنتے ہیں۔ یہ لوگ پیشہ ور اہلکار نہیں بلکہ خواہش کے غلام ہیں، بغیر دولت، بغیر معاوضے اور بغیر احسان کے دشمن کے لئے خدمت کرتے ہیں۔ بڑی خدمتیں یہ لوگ انجام دیتے ہیں، اس لئے کہ واقف کار اور ستھرے ہیں اور درحقیقت کٹھ پتلی نہیں ہیں۔

مکتب کے لئے ۲۳ سالہ جنگ کا دور اختتام پذیر ہوتا ہے اور وہ دور آتا ہے جس میں علیؑ اچانک متوجہ ہوتے ہیں کہ اگر وہ اس گروہ کے خلاف کہ جس نے اسلام کی مصلحت کے نام پر ایسی مناسبت پیدا کی کہ خود آگے آئے، اور علیؑ کو پیچھے کر کے انکا حق پامال کیا، اٹھ کھڑے ہوں تو مدینہ میں بعد رسالتمآبؐ پھوٹ پڑ جائیگی۔ اور عظیم ترین اسلامی شخصیتوں کے درمیان اختلاف و کشمکشِ قبائل اور نیز ایران و روم کے اکاسرہ اور قیاصرہ کی تحریکوں کا سبب ہوگی اور جب وہ دیکھیں گے کہ مدینہ یعنی اس عظیم انقلاب کا مرکز اندر سے بکھر گیا ہے تو بڑی آسانی سے ایک بیرونی ضرب سے اسے اس طرح ڈھادینگے کہ پھر اس کا تاریخ میں کہیں پتہ نہیں ہوگا۔

دوسرا راستہ علیؑ کے پاس یہ تھا کہ وہ داخلی گروہ کی مفاد پرستی اور اپنے مخالف سیاسی گروہ کی موقع پرستی کو برداشت کریں۔ افسوس کے ساتھ کہنا

پڑتا ہے کہ داخلی گروہ نے اسلام کے اندر گھر کرلیا اور بہ نام اسلام دنیا میں شہرت حاصل کی اور اسلامی طاقتیں ان کے قبضہ قدرت میں آگئیں اور ابو عبیدہ جراح، سعد بن ابی وقاص اور خالد بن ولید جیسے اسلامی سورما اور بڑی شخصیتیں ان میں شامل ہوگئیں اور علیؑ کی پارٹی میں (کھجور بیچنے والے) میثم تمارؓ، ایران کی ایک غیر ملکی شخصیت سلمان فارسیؓ، صحرا سے آنے والے ابو ذر غفاریؓ، کہ جو نہ مدینہ کے تھے اور نہ مکہ کے اور ایک غریب حبشی غلام بلالؓ جیسے لوگ تھے کہ جن کی نہ یہاں کوئی واقفیت تھی اور نہ اثر و رسوخ۔ ان سب لوگوں کا سرمایہ ان کی انسانیت ان کا تقویٰ، ان کی معنویت اور اسلام کی خاطر ان کی فداکاری تھی انکا کوئی خاندانی اور اشرافی مرتبہ نہیں تھا۔ جن لوگوں کا معاشرے میں اثر و رسوخ تھا وہ سب علیؑ کے مخالف کیمپ میں تھے۔ یہ لوگ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلامی وحدت کے بہترین نعرے کے ساتھ برسر کار آئے۔

اور علیؑ نے اسلام کی وحدت کے لئے ان کی حکومت برداشت کی اور خاموش رہے۔ ان ۲۵ سالوں میں اس بطلِ جلیل کو کہ جس نے گھمسان کی جنگوں میں دشمنوں کے پرے کے پرے صاف کر دئیے اور جس کے بازو کی ایک ضرب ثقلین کی عبادت سے بڑھ کر تھی، چپ بیٹھنا پڑا۔ یہاں تک کہ ان کے گھر پر حملہ ہوا ان کی زوجہ یعنی جناب رسالتمآبؐ کی بیٹی جناب فاطمہ زہراؑ کی اہانت ہوئی اور پھر بھی آپ خاموش رہے۔ ایک ایسی خاموشی کہ جسے وہ خود ایک انتہائی ٹھوس جملے میں بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں: "میں

نے ۲۵ سال اس طرح گزارے کہ میری آنکھوں میں (غبار اندوہ کی) خلش تھی اور حلق میں (غم و رنج کے) پھندے لگے ہوئے تھے۔"

اور پھر تیسرا باب، عدالت وانصاف کے لئے ۵ سال حکومت۔

آپ نے خود شروع ہی میں اعلان کیا اور کہا کہ اب میں تم پر حکومت اور امارت کی نسبت بیزار ہوں مگر پھر سوچا کہ میں اس طاقت کو حاصل کروں تاکہ شاید پامال شدہ لوگوں کے حق انہیں دلا سکوں یا ان باطل لوگوں میں سے جو کمر سیدھی کئے کھڑے ہیں کسی باطل کو گرا سکوں۔ یہ اعلان علیؑ کی زندگی کا تیسرا باب ہے۔

اس دور میں پھر اس ہستی سے کہ جو خلقت کا معجزہ ہے دوسری باتیں دوسرے مظاہرے، اور نئی قدروں کی تجلی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ سارے عہدے بٹ چکے ہیں اور ایران، روم اور مصر جیسی منافع بخش حکومتیں بنی امیہ اور حضرت عثمان کے اقوام واقارب اور اصحابِ کبار کے ہاتھ لگی ہیں علیؑ چاہتے ہیں کہ ان تمام عہدوں کو بیک وقت ان شخصیتوں کے ہاتھ سے لے لیں جنھوں نے ۲۵ سال کے عرصے میں اپنی جڑیں مضبوط کرلی ہیں اور دین، جہاد اور اللہ کی تلوار کے نام پر سب کو رام کر کے اپنے قبضے میں جکڑ رکھا ہے۔ ایک ایسے دور میں کہ جب حضرت عثمان، اور معاویہ کی بخششوں کی آواز نے دنیا کے سارے سخاوتمندوں کے کانوں سے سماعت چھین لی ہے علیؑ ایسے رد عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں جو انسان کو ہلا دینے والی، ناقابل یقین اور ناقابل برداشت ہے۔

طلحہ اور زبیر کون تھے؟ زبیر، عبدالمطلب کی بیٹی صفیہ کا بیٹا اور خود جناب رسالتمآبؐ کی پھپی کا بیٹا تھا۔ طلحہ، اسلام میں طلحۃ الخیر ہے۔ یہ دونوں چہرے ہمیشہ جناب رسالتمآبؐ اور حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ دیکھے جاتے تھے اور ان کا شمار اسلام کے بانفوذ، مقدس اور ممتاز چہروں میں ہوتا تھا۔ یہ دونوں وہ چہرے ہیں کہ جو حضرت عمر کے اسی شوریٰ میں حضرت علیؑ اور حضرت عثمان کے مقابل خلافت کے امیدوار بنے۔ اب علیؑ کے ہاتھ میں حکومت آئی ہے اور یہ دونوں جانتے ہیں کہ علیؑ بیجا رقم کسی کو نہیں دیتے اور مصلحت کی خاطر خراج یا (آج کی زبان میں) بھتہ نہیں دیتے۔ کہتے ہیں ہم طلحتہ الخیر اور زبیر ہیں، ہم وہ ہیں کہ جن کے اوصاف کو لوگوں نے جناب رسالتمآبؐ کی زبان اقدس سے سنا ہے۔ خلفائے ثلاثہ کے زمانے میں، ہماری شخصیت اسلامی معاشرے میں بہت بلند رہی ہے۔ ہمارا شمار رہبروں میں ہوتا ہے بلکہ ہم حضرت عثمان اور تم سے پہلے اسلامی خلافت کے امیدوار رہے ہیں، اب ہمیں خلافت نہیں چاہئے، کم از کم تم ہمیں دو شہروں کی گورنری دیدو! جناب امیرؑ پھونک مار کر چراغ کو بجھا دیتے ہیں اور یہی ان کا جواب ہے۔ یہ وہ پارسائی ڈھونگ نہیں جو اس وقت بعض لوگ رچا رہے ہیں!

کسی کارخانے کی کھلی زمین میں ریحان (نازبو، جسے بالنگو بھی کہا جاتا ہے اور جو پودینہ کی مثال ہے) بویا گیا تھا۔ یہاں کا ایک مزدور کہتا تھا اس کھیتی کا نگران شخص بڑا مومن اور پارسا آدمی ہے؛ یہاں کے بعض محنت کش

بچے جب روٹی کے ساتھ کھانے کیلئے اس کے کچھ پتے توڑ لاتے تھے تو وہ نگرانی پر مامور پارسا آدمی بچوں کے ہاتھوں سے پتے جھپٹ کر چلاتا تھا کہ یہ تم لوگوں کا نہیں ہے، میرا بھی نہیں ہے، بیت المال کا ہے۔"

یہ ظلم اور سرمایہ داری کے فائر پروف بکسے ہیں۔ اس طرح کے پارسا لوگ جب بدباطن افراد کی خدمت پر مامور ہوتے ہیں تو اس طرح کی پارسائی دکھاتے ہیں اور ان کے فائر پروف بکسے بن جاتے ہیں۔

علیؑ پارسائی کا مظاہرہ نہیں کرتے: جب چراغ بجھاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم چراغ کے بغیر تاریکی میں بات کر سکتے ہیں۔ وہ اس خشک رویہ سے پارسائی پن کا اظہار نہیں کرتے بلکہ یہ طلحہ اور زبیر کا جواب ہے تاکہ وہ، اور باقی تمام صاحبان قوت اور وہ غارتگر لوگ کہ جو حضرت عثمان کے سخاوت بھرے کھلے دستر خواں سے بے تحاشا صاحب ثروت و قوت ہوئے ہیں سمجھ لیں کہ اب وہ دور ختم ہو گیا ہے۔ اس منزل پر طلحہ اور زبیر سمجھ جاتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے اور یہ پیغام کن لوگوں کے لئے ہے۔

علیؑ اپنے پیشتر خلیفہ کے بارے میں کہتے ہیں: "...... یہاں تک کہ اس قوم کا تیسرا شخص پیٹ پھلائے سرگین اور چارے کے درمیان کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ اس کے بھائی بند کھڑے ہوئے جو اللہ کے مال کو اس طرح نگلتے تھے جس طرح اونٹ فصل ربیع کا چارہ چرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جب اس کی بٹی ہوئی رسی کے بل کھل گئے اور اس کی بداعمالیوں نے اس کا کام تمام کر دیا۔" (نہج البلاغہ۔ خطبہ شقشقیہ)

حضرت عثمان اپنے ان تمام شریک کار اور ہمراز و ہم سخن لوگوں کے مظہر تھے جنھوں نے خلافت اسلامی، حکومت اللہ اور اللہ کی راہ میں جہاد سے وابستہ رہنے کا عہد کیا ہوا تھا۔

اب علیؑ آئے ہیں اور ان سب کیلئے جنھوں نے خوب اچھی طرح سیر ہو کر چرا ہے اور اب بڑی مضبوط طاقت بن گئے ہیں اعلان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں ان لوگوں سے اس تمام دولت کو واپس لونگا جنھوں نے قوم کے پیسے کو اپنا مال سمجھ کر بے دریغ کھایا ہے خواہ یہ دولت ان کی بیویوں کے سندِ عقد میں کیوں نہ لکھ دی گئی ہو۔

علیؑ کی ۵ سال رزم آرائی، عدالت اور انصاف کے انعقاد کے لئے ہے، کیونکہ اب یہاں مشرک نہیں کہ جس کے لئے مکتب کی جنگ ہو، خر مقدس، رند اور منافق لوگ ہیں جن کے خلاف علیؑ کو جمل، صفین اور نہروان میں لڑنا ہے اور سب سے مشکل جنگ، جمل کی ہے۔

صفین میں بنی امیہ کے جانے پہچانے پلید چہرے ہیں جو علیؑ کے مقابل آئے ہیں، نہروان میں ناشناس مقدس مآب مومنوں سے صف آرائی ہے۔ لیکن جمل کو کیا کیجئے، اس میں کون ہے؟ ام المومنین عائشہ، طلحۃ الخیر، اور عبدالمطلب کا نواسہ زبیر۔ یعنی اسلام کی اعلیٰ ترین شخصیتیں۔

یہ جنگ ناقابل برداشت ہے، ہلا دینے والی ہے حتیٰ علیؑ کے ان پیروکاروں کیلئے بھی جو آپ کے ساتھ لڑنے آئے ہیں۔ علیؑ کے سپاہیوں میں سے ایک سپاہی نے ان سے بعنوان اعتراض پوچھا کہ اگر آپ نے نصیحت کی

اور انہیں صلح کی دعوت دی اور انہوں نے نہیں مانا تو پھر آپ کیا کریں گے ؟ علیؑ نے جواب دیا میں ان سے لڑونگا۔ سپاہی نے تعجب سے پوچھا : آپ ام المومنین اور طلحہ اور زبیر سے لڑیں گے ؟ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ لوگ باطل پر ہوں ؟

اس منزل پر علیؑ کا ایک جملہ ہے جس کے بارے میں طہ حسین کہتے ہیں : "جب سے بات کرنے کا آغاز ہوا ہے اس وقت سے زبان بشر میں میں اس عظمت اور اس بلندی کا جملہ معرض وجود میں نہیں آیا ہے"، اور وہ یہ ہے کہ آپ کہتے ہیں: "تم حق کو فرد سے پرکھتے ہو یا فرد کو حق سے ؟" حقیقت کو شخصیتوں کی رو سے تشخیص دیتے ہو یا شخصیتوں کو حقیقت کی رو سے ؟

"حق" کے اپنے معیار ہیں کہ جو اشخاص نہیں ہیں، پارسا نہیں ہیں اور تشخیص کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان معیاروں کی طرف پلٹیں اور شخصیتوں کو ان سے جانچیں۔

نہروان میں مخالف صف کا ایک دشمن، بڑی ملیح، رقت آمیز اور دل میں اترنے والی آواز کے ساتھ قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔ اس پیاری آواز نے علیؑ کے پیروکاروں کے دل موہ لئے اور ان میں سے ایک نے علی سے کہا: یہ لوگ کس طرح باطل پر ہو سکتے ہیں جو اس کیفیت کے ساتھ دعا کر رہے ہیں اور قرآن پڑھ رہے ہیں علی نے کہا: یہ بات میں کل تمہیں بتاؤنگا۔ دوسرے دن جنگ کا آغاز ہوا اور یہ سب مقدس اور پارسا لوگ مارے گئے۔

علیؑ نے اسی شخص کو کہ جو گزشتہ روز بڑا متاثر تھا آواز دی اور کیچڑ میں نیزہ مار کر ایک مقدس نما جسم کو باہر نکالا اور کہا: "یہ ہے اس شخص کی سرنوشت جس نے تمہیں اتنا متاثر کر دیا تھا اور اب اس کا کل اس سے بدتر ہوگا۔"

حقیقت کا ایک معیار ہوتا ہے۔ ہمیں ان باتوں سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔ یہی وہ منزل ہے کہ جس میں عدالت اس قدر سخت ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ علیؑ اپنے تینوں کرداروں کے اندر مطلق صورت میں ابطل جلیل ہیں۔ مطلق برائے کتب: کہ جس میں ہم ایک فرد کو بھی ان ۲۵ سالوں میں علیؑ کے کردار کے ہم پلے تو کیا ان کے مشابہ اور معادل بھی نہیں دیکھتے۔

مطلق در شکیبائی: کوئی ۲۵ سال کی خاموشی کو نہ جھیل سکا۔ نہ معاندین، نہ مخالفین اور نہ ہی ان کے دوست، یہاں تک کہ ابوذر کی طاقت بھی طاق ہوگئی اور وہ چلا پڑے۔

اور مطلق سخت در عدالت: کہ جو نہ صرف اپنے مخالف کیلئے، نہ صرف حضرت عثمان کی سبز کھیتوں کو چرنے والوں کے لئے بلکہ ان کے بھائی تک کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

ہم حضرت عمر کو ان کی عدالت پسندی کے چرچوں کے باوجود دیکھتے ہیں کہ انہوں نے معاویہ کو بربنائے مصلحت شام پر مسلط کیا اور یہی حال حضرت ابوبکر کا ہے کہ انہوں نے خالد بن ولید کو اس کی گھناؤنی کارروائی کے باوجود بربنائے مصلحت معاف کیا۔ لیکن علیؑ کی لغت مصلحت سے خالی ہے۔

یہ وہ ہستی نہیں جو مصلحت کو جانے۔ حقیقت، سر تاپا ایک ہے، مکمل ہے۔ کوئی شے اس سے الگ نہیں ہو سکتی۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ علیؑ کا انصاف اور ان کی عدالت اتنی سخت اور بھاری ہے کہ اس کو ان کے بھائی عقیل بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ برگزیدہ ہستی کہ جو بچپن سے علیؑ کے ساتھ جناب رسالتمآبؐ کے گھرانے میں رہی اور جو جناب ابو طالب کا فرزند ہے علیؑ کی حکومت میں اس وقت جبکہ وہ معاویہ سے بر سر پیکار تھے معاویہ کے پاس چلی جاتی ہے۔ اور یہ کوئی مذاق بات نہیں ہے!

حضرت عمر کے مارے جانے کے بعد ان کا بیٹا عبداللہؓ ابن عمر اس بات کو بھول جاتا ہے کہ اب اسلام، قانون اور مقدمہ کا دور ہے۔ وہ قبائلی دور میں، انتقام خون پر چلا جاتا ہے اس لئے کہ دور جاہلیت میں خون کا انتقام بڑے بیٹے کے ذمے رہا ہے۔ اس کے بعد وہ بغیر شرعی عدالت، بغیر مقدمہ، بغیر قانون اسلام اور بغیر قانون قصاص کے اپنے باپ کے قاتل ابو لؤلؤ فیروزان کو جو ایک ایرانی تھا ان تمام ایرانیوں کے ساتھ جو اس سے منسلک تھے ذبح کر دیتا ہے۔ اور پھر جب حضرت عثمان بر سر کار آتے ہیں تو دو دن بعد وہی اس قاتل کو آزاد کر دیتے ہیں اس لئے کہ یہ حضرت عمر کا بیٹا ہے اور مصلحت نہیں کہ وہ قید میں رہے! لیکن علیؑ کہ جو کینہ جوئی سے بلند ہیں، اور بلند ترین منصب یعنی مصر کی فرمانروائی کو حضرت ابو بکر کے بیٹے کے سپرد کرتے اور اسے اپنا بیٹا قرار دیتے ہیں مسلسل کہتے ہیں کہ میں فیروزان اور ان

کے ان دوستوں کے خون کا انتقام لونگا جو بغیر قانونی کارروائی کے قبائلی عرب کے وحشیانہ قانون کی بنیاد پر قتل عام ہوئے ہیں۔

اور یہی طلحہ اور زبیر جب یہ دیکھتے ہیں کہ وہ علیؑ کی خلافت میں حتیٰ دو شہروں کی گورنری تک کی امید نہیں رکھ سکتے تو حضرت عائشہ کے پاس چلے جاتے ہیں تاکہ جنگ کا سامان فراہم کریں۔ جانے سے پہلے وہ علیؑ کے پاس آتے ہیں تاکہ ان سے شہر چھوڑنے کی اجازت حاصل کریں۔ علیؑ کہتے ہیں مجھے معلوم ہے کہ تم کہاں اور کیوں جا رہے ہو، لیکن خیر، جاؤ!

عجیب بات ہے! یہ دونوں ان کی حکومت کے حدود سے باہر جانا چاہتے ہیں تاکہ ان کے خلاف مسلحانہ اقدام کریں اور تلوار اٹھا کر علیؑ کے زمانے کی سب سے بڑی سازش کو جنم دیں۔ مگر اس کے باوجود علیؑ ان سے کہتے ہیں کہ "جاؤ"! مگر کیوں؟ اس لئے کہ یہ دونوں انسان ہیں اور اگر وہ کسی جرم کے ارتکاب سے پہلے انہیں روکتے ہیں تو گویا ان کی اس آزادی کو سلب کرتے ہیں جو ہر انسان کا حق ہے: آزادی سفر اور آزادی مسکن۔ اور اگر یہ آزادیاں سلب ہو جائیں تو ایک ایسا قانون وجود میں آئے گا کہ جس میں تاریخ کے سارے ظالم و جابر افراد لوگوں کی آزادی کو کچلنے کے لئے علیؑ سے متوسل ہونگے اور مثال میں انہیں پیش کریں گے۔

بقول جارج جرداق: "کہاں ہیں حقوق بشر کی بات کرنے والے آئیں اور حقوق بشر کو عمل میں دیکھیں، نہ یہ کہ تقریروں، خطبوں، جلسوں، اور UNO، اور یونسکو میں اس کی پرچار کریں۔ یہ سب جھوٹ

ہیں"۔ دنیا کے سارے انقلاب لانے والوں کا یہ قانون ہے کہ کامیابی سے پہلے وہ حد درجہ انقلابی ہوتے ہیں، عدل و انصاف کی بات کرتے ہیں، اس راہ میں اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالتے ہیں لیکن جونہی کرسی سنبھالتے ہیں محتاط ہو جاتے ہیں۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے عظیم انقلابی لوگ طاقت کے حصول اور سیری کے بعد کس طرح سیاست کے پیشہ ور کھلاڑی بن جاتے ہیں (اور بعض سیری سے پہلے بھوکے پیٹ بھی سیاست باز ہو جاتے ہیں)، اور پھر بقول جارج جرداق کے، صرف اور صرف علیؑ کی ذات وہ ہے کہ جو اس وقت بھی جب وہ جناب رسالتمآبؐ کی جماعت کے ایک فرد تھے اور مکتب کے لئے لڑ رہے تھے انقلابی تھے اور اس وقت بھی جب ان کے ہاتھ میں طاقت نہیں تھی اور انہوں نے خاموشی اختیار کی تھی انقلابی رہے اور نیز اس وقت بھی یہ صفت ان میں رہی جب ۵ سال کی حکومت میں ساری طاقتیں ان کے پاس تھیں۔ علیؑ وہ تنہا انسان ہیں کہ جو پہلی بار حکومت پر فائز ہوئے اور اس حکومت کے خلاف جس کی ڈور خود ان کے ہاتھوں میں تھی، عدالت کی خاطر، شورش کی، ابھی صحیح طور پر ان کی حکومت جمی نہیں تھی اور ابھی ٹھیک طور پر وہ مدینہ پر مسلط نہیں ہوئے تھے کہ انہوں نے معاویہ کو ـــ جس کو کہ حضرت عمر بھی ہٹا نہیں سکے بلکہ انہوں نے اسے خراج دیا اور کہا شام، ابوسفیان اور اس کے بیٹوں کا نوالہ رہے ـــ معزولی کا خط لکھا۔ سب کو معلوم تھا کہ معاویہ شام سے دست بردار نہیں ہوگا اور اس موضوع کو بہانہ بنا کر جنگ چھیڑ دے گا۔ اور سب یہ جانتے تھے کہ علیؑ

اور معاویہ کی جنگ، روشن خیال نماست عنصر شیعوں کی، ایک انتہائی سخت اور انتہائی متعصب منظم فوج سے جنگ ہے اور شکست علیؑ کی جماعت کے حصے میں آئے گی۔ لیکن علیؑ کہتے ہیں کہ اگر میں ایسا نہیں کرونگا اور معاویہ کو باقی رکھونگا تو اس کے ظلم، اس کی بدی اور اس کے جرائم میں اس کا شریک رہونگا اور اس کی مجھے جوابدہی کرنی پڑے گی۔ اور میں اپنی ہر شے کی نابودی کی قیمت پر ایسا نہیں کرونگا۔

علیؑ وہ ہستی ہے کہ جس نے اپنی قوم میں ایمان، اور ایک ہدف اور ایک عقیدہ کو قائم کرنے کے لئے ۲۳ سال جنگ کی، ۲۵ سال تحمل سے کام لیا اور اپنے دوستوں، اپنے ہم صف لوگوں بلکہ ہر کسی کی خود غرضی، سازش اور خود پرستی کو، مشترک دشمن کے مقابل وحدت کی برقراری کے لئے برداشت کیا اور خاموش رہے اور ۵ سال، عدالت کو مفہوم دینے، ظالم سے مظلوم کا انتقام لینے، باطل کو مٹانے اور لوگوں کے حق کے استقرار کے لئے، حکومت کی۔

علیؑ نے کھجوریں بیچنے والے میثم کو جب اس کیفیت میں دیکھا کہ وہ اچھے کھجوروں کو خراب کھجوروں سے الگ کر کے دو مختلف قیمتوں میں بیچ رہے ہیں تو بگڑ کر کہا: "اللہ کے بندوں کو کیوں تقسیم کر رہے ہو؟!" اور پھر سب کو اپنے ہاتھوں سے ملا کر کہا "اب ایک درمیانہ قیمت سے انہیں فروخت کرو"، یعنی مصرف میں مساوات، دنیا کے تمام انصاف پسند مکاتب میں عدالت کی بنیاد۔

۲۳ سال مکتب، ایمان اور عقیدے کے لئے جنگ، ۲۵ سال، بیرونی دشمن کے مقابل اتحاد کی برقراری کے لئے تلخیوں اور افراد کی خود غرضیوں کا تحمل، اور ۵ سال عوام میں انصاف کی برقراری کے لئے حکومت۔

یہی وجہ ہے کہ آج اسلامی معاشرے کے آزاد حریت پسند، اور استعمار و استبداد و ناروا ترجیحات کے مخالف روشن خیال آدمی کو خواہ وہ کسی مذہب اور کسی مکتب کا کیوں نہ ہو، علیؑ کی ضرورت ہے، اس لئے کہ آج، اسلامی معاشرے نے اپنا ایمان اور اپنا ہدف کھو دیا ہے اور ایمانی جذبہ اس کی سوچ کی راہوں میں دفن ہو گیا ہے اور اسے مکتب کی ضرورت ہے۔

اسلامی معاشرے کو، ایک انقلابی فکری شرارے کے لئے "مکتب" کی ضرورت ہے، اسلامی معاشرے کو استعمار کے باب میں "وحدت" کی ضرورت ہے اور مسلمان عوام کو ناروا ترجیحات کے نظام میں "عدالت" کی ضرورت ہے۔

اور اسی لئے انہیں :

"علیؑ"

کی ضرورت ہے

مجھے فخر ہے کہ میں علیؑ والا ہوں!

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر علی شریعتی

Ali's followers & their Sufferings

علیؑ کے پیروکار اور ان کے دکھ

مترجم : سید محمد موسیٰ رضوی

تقی شریعتی

آج کی رات یہ طے تھا کہ میرے استاد اور میرے والد بزرگوار ۔۔۔ کہ آج جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے انہی کے دم سے ہے ۔۔۔ علیؑ اور ان کے دکھوں کے بارے میں گفتگو کریں، لیکن میرے دوستوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ان چند دقیقوں میں جو شب بیداری کے مراسم کے شروع ہونے میں رہ گئے ہیں کچھ اظہار خیال کروں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ ایسے وقت اور ایسی رات میں مجھے کیا کہنا چاہیے؟ آج رات گفتگو میرے لئے بہت مشکل ہے۔ میں نے سوچا کہ "علیؑ اور ان کے دکھ" کے موضوع کے بجائے میں علی کے پیروکاروں اور ان کے دکھ کے بارے میں گفتگو کروں۔

"اس سے بڑا دکھ اور کیا ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم علیؑ کی دیوانی ہو اور اس کی عاقبت یزید کی عاقبت ہو! اس سے بڑا دکھ اور کیا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کس معنویت، کس آگاہی، کس طرز سخن اور کس سطح کے منصف لوگ اب علیؑ اور ان کے مکتب کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں اور لوگوں کو علیؑ سے متعارف کرا رہے ہیں۔ اس سے بڑا دکھ اور کیا ہے کہ اس دنیا میں ایک ایسی

قوم اور ایک ایسا گروہ ہے کہ جس کی تقدیر کی پیشانی پر علیؑ کی مہر لگی ہوئی ہے لیکن وہ فقر، خواب، بے حسی، تفرقے، کوتاہ اندیشی، مایوسی، اور ضعف و ذلت سے دکھ جھیل رہی ہے؛ اس سے بڑا دکھ اور کیا ہے کہ اب ہمیں یہ دیکھنے کو مل رہا ہے کہ ہماری وہ قدیم نسل کہ جو علیؑ اور علیؑ کے مذہب کی نسبت وفادار ہے اپنی نتیجہ خیزی کی قوت اور حرکت کو کھو چکی ہے اور جمود و توقف سے دوچار ہو گئی ہے اور آنے والی نسل کو علیؑ کے مذہب، علیؑ کی ثقافت، اور علیؑ کی تاریخ سے ہم آہنگ نہیں کر سکتی ہے اور جو کچھ کہ عظیم شیعہ عالموں، عظیم شیعہ شہیدوں، عظیم شیعہ ہستیوں، اور بلند پایہ لوگوں نے اس نسل کے سپرد کیا ہے وہ اسے بعد کی نسل کو منتقل نہیں کر سکتی ہے۔"

یہ نسل کہنہ ہو رہی ہے، فرسودہ ہو رہی ـــ بلکہ ہو گئی ہے ـــ اور ڈھل رہی ہے، موت کے منہ میں جا رہی ہے، اور اس کی جگہ بے مغزی، معنوی فقر، جہل، علیؑ سے بے ربطی اور گزشتہ سے لاتعلقی لے رہی ہے۔

اس وقت ہم ایک خاص صورتحال میں ہیں۔ کوئی رات اور کوئی لمحہ اس رات اور اس لمحہ سے بہتر نہیں ہے کہ جس میں اس طرح کا مسئلہ بیان ہو سکے البتہ مجھ جیسے انسان کے توسط سے نہیں، مگر کیا، کیا جائے، ایسی صورت پیش آگئی ہے۔ میرے پاس نہ اتنا وقت ہے اور نہ اتنا حوصلہ کہ میں جذبات بھری تقریر کروں اور بہت منطقی اور آہستہ آہستہ بولوں فقط آپ

حضرات اس ڈھیر سارے درد کا احساس کریں جو میرے ہر لفظ کی پشت پر ڈیرہ جمائے ہوئے ہیں۔

یہ وہ موقع ہے جو ہمارے ہاتھ سے جا رہا ہے۔ بیچ کی ایک نسل، آنیوالی اور گزشتہ نسل کے درمیان موجود ہے اور یہی ہمارا سرمایہ اور ہماری امیدوں کا مرکز ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جو ابھی اپنے مذہب کی جستجو میں ہے؛ ابھی اپنے مذہب کو پہچاننے کا دغدغہ اس میں موجود ہے ابھی ان میں یہ چاہ موجود ہے کہ وہ علیؑ کو، علیؑ کے حقیقی چہرے کو پہچانیں۔ لیکن جس صورت سے علیؑ کو پیش کیا جا رہا ہے وہ ان کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ یہ متوسط نسل، گزشتہ اور آئندہ نسل اور ہماری مذہبی ثقافت اور آنے والے استعماری ثقافت کے درمیان واسطہ ہے اس نسل کے درمیان واسطہ ہے کہ جو بہرحال ایک مذہبی روح سے متصل تھی اور جو اس سے کٹ کر کل ایک بے کار بے معنی اور بے مغز نسل ہو جائے گی۔ لیکن یہ متوسط نسل اور یہ گروہ ہمیشہ نہیں رہے گا۔

یہ بات میں آپ کے گوش گزار کر دوں کہ اگر دس، پندرہ، بیس، سال بعد ان "ارشادی" امام بارگاہوں کا وجود اس ملک میں باقی رہا اور انہیں باقی رہنے دیا گیا اور ان مراکز نے نوجوانوں، تعلیم یافتہ لوگوں، طالب علموں اور دانشگاہی نسل کیلئے مذہب کی بنیاد پر بہترین پروگراموں کا انتظام بھی کیا تب بھی آپ آج کی طرح، لوگوں کا یہ اژدھام نہیں دیکھیں گے۔ اس طرح استقبال نہیں ہوگا، اس طرح نہیں ہوگا کہ

ہزاروں طلباسات آٹھ گھنٹے بدترین حالات میں ایک دینی اجتماع میں شرکت کریں اور مذہب کی باتیں سنیں۔ اگر ہم اپنی جگہ سے نہ ہلے اور ہم نے کچھ نہ کیا تو پھر کوئی مذہبی دغدغہ ان کے وجود میں باقی نہیں رہے گا۔

وہ لوگ کہ جو کبھی اس طرح کے ماحول اور اس طرح کی مجلسوں میں نہیں آئے اور ان مسائل کے عام سننے والے نہیں ہیں اور ہمیشہ اپنی انفرادی زندگی یا تجارتی، سائنسی اور پیشہ ورانہ مسائل میں الجھے ہوتے ہیں اور گاہے گاہے سال بہ سال ایسی راتوں میں حاضری دیتے ہیں ان لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس پیام کو ایسے وقتوں، ایسے حالات اور ایسے موقعوں پر زیادہ توجہ سے سنیں۔ اور اس کو کسی مذہبی رہنما، کسی عالم، کسی استاد اور کسی مرجع سے نہ سنیں ایک معلم کی زبانی سنیں کہ جو رخ حیات کو اس کے تمام وجود کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ یہ نسل ہاتھ سے جاری ہے، دیکھتا ہے کہ کچھ کر گزرنے کیلئے صرف ایک نسل سے زیادہ کا وقت باقی نہیں رہا ہے۔ اگر ہمیں علیؑ، اس کے مکتب، مذہب، اسلام اور ان سب پر جو ہمارے مقدسات اور اعتقادات کو تشکیل دیتے ہیں حقیقتاً ایمان ہے تو ہمیں چاہئے کہ ہم بڑی شدت سے، بڑی تیزی سے، بڑے ایثار سے، بڑے صبر و تحمل و کوشش سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس کے لئے کچھ کریں۔

سازشی لوگ بدگمانیوں، افواہ سازیوں اور مذموم اور بدآموز گلوں سے ـــ کہ جو دین کے نام سے یا علم کے نام سے یا روشن خیالی کے

نام سے یا دین دشمنی کے نام سے یا پھر تمدن کے نام سے تبلیغ کر رہے ہیں ـــ ہمیں ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں ہمارے اندر فاصلے پیدا کر رہے ہیں، ہمارے ہمدردوں، ہمنواؤں اور ہم سرنوشتوں کو ایک دوسرے سے جدا کر رہے ہیں، جن لوگوں کو چاہئے کہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں ان کو ایک دوسرے کے مقابل لا رہے ہیں تاکہ دنیا کے اس مٹھی بھر گروہ کو کہ جو اپنی سرنوشت اور اپنے مکتب و مذہب کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں، انہیں بکھیر دیں، مضمحل کر دیں تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کریں، داخلی دائمی جھڑپوں میں مصروف کر دیں ان کے بہترین وقت کو ایک دوسرے کی دشنام ترازی، فحش کلامی، تفسیق و تکفیر اور لڑائی جھگڑوں میں گزاریں تاکہ موقع ہاتھ سے نکل جائے تاکہ وہ لوگ جنہیں دشمن کے مقابل اٹھ کھڑا ہونا چاہئے تھا ایک دوسرے کے مقابل اٹھ کھڑے ہوں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

لیکن ہماری خوش نصیبی یہ ہے کہ یہ درمیان کی نسل کہ جو نہ تو نئی ثقافت اور مغربی تسلط سے مرعوب ہوتی ہے اور نہ گزشتہ کے ان کہنہ و فرسودہ سانچوں کو جنہیں مذہب کے نام سے اس پر مسلط کیا جاتا ہے قبول کرتی ہے، اپنے دین اور اپنے ایمان کیلئے نئی راہیں تلاش کر رہی ہے وہ سب سے پہلے اپنے مذہب کی شناخت کے درپے ہے۔ اس لئے کہ وہ آگاہ ہے، باخبر ہے، اس نے خطرہ کو محسوس کر لیا ہے 'ضرورت' بڑی قوت سے اس کے ادراک میں اتر آئی ہے اس کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا ہو گیا ہے

اور ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں کہیں اسے کسی کتاب، کسی پروگرام، کسی کلاس کسی تقریر کی خبر ملتی ہے وہ اس کی طرف والہانہ انداز میں دوڑ پڑتی ہے اور اپنی پوری طاقت اور پورے ایمان سے ان کی شیفتہ اور ان کی وفادار بن جاتی ہے اور اپنے آپ کو ان کی نسبت ثابت قدم رکھتی ہے۔ وہ لوگ کہ جو اس گروہ میں شامل نہیں ہیں لیکن اپنے مذہب، اپنے ایمان، اپنے لوگوں کی سرنوشت، اپنے بچوں کی سرنوشت اور اپنے ملک، اپنی ملت اور اپنی نسل کے مستقبل کی سرنوشت کے مقابل احساس ذمہ داری کرتے ہیں انہیں چاہئے کہ وہ ان کی ـــــ اس واحد مرکز اور اس واحد قوت کی کہ جس کا وجود آئندہ کے لئے ہے اور جو اس مذہب کیلئے اس صدی میں کام کر سکتی ہے ـــــ ، حمایت کریں، انہیں چاہئے کہ وہ اپنے قلم، اپنے قدم، حتیٰ اپنی گفتگو سے آپ کی مدد کریں، اس گروہ کی ذہنی، فکری اور سماجی پیشروی کیلئے راہ ہموار کریں تاکہ بہترین وسائل ان کے لئے مہیا ہوں اور وہ اپنی آرزو کو ـــــ کہ جو ان کے دین کی حقیقت کی شناخت ہے ـــــ پایہ تکمیل تک پہنچائیں اور ظفریاب ہوں۔

علیؑ کے پیروکاروں کا دکھ علیؑ کے خود کے دکھوں سے زیادہ ہے اس لئے کہ علیؑ کے خود کے دکھ بجز ان کے پیروکاروں کے دکھ کے نہیں۔ علیؑ اس سے بہت بلند ہیں کہ اپنے دکھوں سے دکھی ہوں۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جب وہ احد میں، حنین میں، بدر میں کفر کے، شرک کے، اور دشمن کے دوبدو آتے ہیں تو شیر کی طرح دھاڑتے ہیں، لیکن جب وہ اپنے

پیروکاروں کے درمیان ہوتے ہیں، کوفہ کی مسجد میں خلیفہ ہوتے ہیں اور ان کے سارے چاہنے والے انہیں گھیر لیتے ہیں تو یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں ہم علیؑ کی فریادوں کو سنتے ہیں، جہاں وہ شدت غیض اور درد کے دباؤ سے ناتوانی کے عالم میں اپنے چہرے پر طمانچے مارتے ہیں۔

اور آج کی شب، وہ شب ہے جس میں علیؑ کے سر مبارک پر ضربت لگی ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک اور سرنوشت، ایک اور حیات اور ایک اور وجود کو بھی دھچکا لگا ہے اور وہ ان کے پیروکاروں، ان کی ثقافت اور ان کے مکتب کی حرکت و حیات و سرنوشت اور ان خلقی اندوختوں کا خسارہ ہے جن کو انہوں نے ان کے پیروکاروں نے اور ان کے خاندان والوں اور عظیم المرتبت فرزندوں نے ہمارے لئے چھوڑا ہے۔ علیؑ کے بڑے دکھوں میں ایک دکھ یہ بھی ہے کہ ان کے اقدار ـــــ کہ جو زمین و زماں کے احاطے میں نہیں آتے ـــــ ہمارے ہاتھ پڑ جائیں، ہم اس کے متولی بن جائیں، ہم ان کی شناسائی، ان کے عمل ان کی پیروی اور نوع بشر کو اس نجات دہندہ مکتب سے روشناس کرانے کے سلسلے میں ذمہ دار بن جائیں۔

آج کی رات ایک بہت عظیم اور دردناک رات ہے۔ یہ وہ رات ہے کہ جس میں علیؑ کی یاد نہ صرف یہ کہ ان کی عظیم روح کے تمام دکھوں کی یاد تازہ کرتی ہے بلکہ تاریخ بشر کے مظلوموں، محروموں اور مصیبت زدہ لوگوں کے تمام دکھوں کو بھی سامنے لاتی ہے اس لئے کہ علیؑ تاریخ بشر میں عدالتِ مظلوم کی مجسم صورت ہیں۔ علیؑ نہ صرف قرآن ناطق ہیں بلکہ

آزادی ناطق عدالت ناطق اور بلند پایہ انسانیت کے ناطق بھی ہیں۔ بشریت نے جتنی تکلیفیں جھیلی ہیں، جتنی شہادتیں پائی ہیں، جتنے عذاب جھیلے ہیں جتنے کوڑے کھائے ہیں اور انسانی روح و وجدان نے جتنے ظلم، جتنی پریشانیاں، جتنے فریب اور جتنی دغابازیاں سہی ہیں وہ سب علیؑ کے چہرے اور علیؑ کی زبان میں اتر آئی ہیں اور ان سے فریاد کر رہی ہیں، علیؑ کے دکھ یہ ہیں۔ اور اسی لئے جونہی وہ تلوار کو اپنے سر اور اپنے مغز پر محسوس کرتے ہیں بیساختہ ان کے منہ سے نکلتا ہے "فزت ورب الکعبة" : کعبہ کے رب کی قسم میں مجھے نجات مل گئی۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی روح میں احساس ہو، کوئی فرد انسان ہو اور علیؑ کی والہانہ تعریف نہ کرے اس کی ہر چیز علیؑ نہ ہو۔ علیؑ اپنے دونوں چہروں میں کمال کی بلندی پر ہیں: اپنی زندگی کے عظیم چہرے میں بھی اور ساری بلند پایہ خصوصیتوں اور بلند پایہ انسانی اقدار کے چہرے میں بھی۔ ایک طرف علیؑ کے سارے دشمن جرم و جنایت و شیطنت کے پست ترین درجہ اور ہر رخ سے انسانی پلیدی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور دوسری طرف علیؑ کے خاندان اور ان کے گھرانے نے ان سارے بلند پایہ جنتوں کو کہ جن کے بارے میں مطلق پرست بشریت سوچ سکتی ہے ایک چھت کے نیچے اور ایک چہار دیواری کے اندر جمع کر دیا۔ یہ بات بڑی آسان ہے کہ ایک صاحب قلم اور ایک صاحب فکر پوری تاریخ بشر اور پوری قوم میں ڈھونڈ کر ہر نوع، ہر خصوصیت اور ہر صنف کیلئے ایک برتر اور بالاتر

بطل جلیل، نکالے، وہ مثالی عورت کے عنوان سے کسی قوم اور کسی صدی میں کسی عورت کو ڈھونڈ کر نکال سکتا ہے، طول تاریخ میں ان حریت پسندوں، شہیدوں، اعلیٰ مرتبے والے انسانوں کے درمیان سے کہ جنھوں نے لوگوں کی آزادی کیلئے اپنی اسارت، اور لوگوں کی زندگی کیلئے اپنی موت کا انتخاب کیا ایک مثالی انسان، ایک مثالی آدمی اور ایک سورما کو نکال سکتا ہے اور اسی طرح اگر کوئی طول تاریخ میں ٹٹولے تو ایک عظیم اور مثالی ماں کو ساری بشریت کیلئے ڈھونڈ سکتا ہے، لیکن ان سب کا ایک ہی زمانے میں، ایک ہی نسل میں اور ایک ہی کمرے میں ہونا معجزہ ہے، خلاف فطرت اور خلاف عقل ہے اور علیؑ اسی طرح کے صاحب خانہ ہیں۔ اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، ان کا گھرانہ وہ گھرانہ ہے جس کا مرد علیؑ، جس کی زوجہ فاطمہؑ، جس کے بچے حسینؑ اور جس کی بیٹی زینبؑ ہے۔ اور خود علیؑ راہ ایمان میں محاذ پر ایک دلیر اور شمشیر زن بطل جلیل ہیں وہ، مضبوط آگاہ اور ذمہ دار صاحب قلم ہیں کہ جنھوں نے اپنے قلم کو انسان میں عظیم خدائی اقدار کی خدمت کیلئے مقرر کیا ہے۔ وہ سخنور ہیں کہ جو دوسرے سخنوروں اور خطیبوں کی طرح، درباروں، دارالخلافتوں، حکومتوں اپنی قومی قدروں، اشرافی لوگوں، اور اپنے طبقہ کی خدمت پر مامور نہیں ہیں بلکہ یہاں بھی انسانیت کی خدمت پر مامور ہیں؛ علیؑ ایک ذمہ دار، آگاہ، حسین، منطقی، استوار، اثر بخش اور انسان کو منقلب کر دینے والی گفتگو کے مظہر ہیں۔ زیبا ترین خدائی کلمات کو صرف علیؑ کی زبانی سنا جا سکتا ہے۔

یہ کام صرف علیؑ کے حلقوم اور حنجرے سے بن آتی ہے۔ علیؑ اپنے عظیم المرتبت دوست جناب رسالتمآبؐ کے ایک انتہائی وفادار دوست ہیں: جس لمحے پیغمبر اسلام کا سرد بدن علیؑ کے ہاتھوں پر تھا اور علیؑ ان کے بدن پر پانی ڈال رہے تھے اور ان کا کلیجہ جل رہا تھا، انہوں نے دیکھا کہ ان کے کانوں کے پاس ان کی سرنوشت بدل رہی ہے، اور ان کے گھر کی دیوار کے پاس ہر چیز میں تبدیلی آرہی ہے انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے گھرانے اور ان کے فرزندوں کی سرنوشت ہمیشہ کیلئے قیدیوں، شہادتوں، اور زہر خورانیوں کی سرنوشت ہو رہی ہے، لیکن دوست، بلکہ دوست کے بے جان بدن کی نسبت ان کے عشق و وفا و محبت نے انہیں ایک ایسی کیفیت میں پہنچا دیا تھا کہ انہوں نے اپنے ذہن سے ہر بات نکال دی تھی اور یہ بات ان کے لئے شرمناک تھی کہ ایسے عالم میں کہ جب محمدؐ ان کے ہاتھوں پر ہوں وہ سیاست کی بات کریں، طاقت کی گفتگو کریں اور مصلحت سے کام لیں۔ وہ ایک جانثار انسان کے مظہر ہیں، ایک ایسے انسان کے کہ جن کی جانثاری قابل تصور نہیں، ایک ایسے انسان کہ جس نے دس برس کے سن سے مہلک جنگوں اور انقلاب میں رہ کر زندگی کا سفر طے کیا اور اب انہیں دوست کی بددیانتی کے مقابل صبر و سکوت سے کام لینا پڑ رہا ہے تاکہ مشترک دشمن کے مقابل ان کا قابل احترام میراث کہ جو اسلام ہے محفوظ رہے۔ اور اس امر کیلئے انہوں نے ۲۵ سال خاموشی اختیار کی (۳۳ سال کی عمر سے ۲۵ سال تک یعنی عام حالت میں کسی انسان کی زندگی کا اعلیٰ ترین حصہ):

یہ تمام عرصہ انہوں نے یا کاشتکاری میں گزاری یا گھر بیٹھ کر قرآن کی جمع آوری اور تدوین کا کام کیا تاکہ ان کا فرزند ـــ اسلام ـــ کہ جس سے ان کا والہانہ لگاؤ تھا ان کی تلوار اور ان کی قربانیوں سے قوام پکڑے اور محفوظ رہے، خواہ وہ غاصب ماں کے دامن ہی میں کیوں نہ ہو۔ علیؑ ایک غیر معمولی، بے نظیر، نایاب انسان اور اپنی نظیر آپ ہیں۔ وہ واحد انسان ہیں کہ جب حکومت پر آتے ہیں تو پہلے قدم ہی پر ان کا کام انقلابی ہوتا ہے اور جب مرتے ہیں تو ان کی موت بھی انقلابی ہوتی ہے۔ علیؑ وہ واحد حکمران ہیں جو اپنی پوری حکومت میں انقلابی رہے ہیں، ان ۲۵ سالوں میں جب ان کے اختیارات سلب تھے اور انہیں دیوار سے لگا دیا گیا تھا وہ محتاط تھے اور جب انہوں نے عظیم امپراطوری سلطنت کی باگ ہاتھ میں لی تو انقلابی ہو گئے اور یہ وہ سرنوشت ہے کہ جس کو سارے لوگ اس کے برعکس طے کرتے ہیں: ہر کوئی انقلابی ہوتا ہے لیکن جب وہ برسرکار آتا ہے تو محتاط ہو جاتا ہے۔ علیؑ وہ صاحب فکر اور بلند سوچ والے دانشمند ہیں کہ جن کی روح سطح زمین اور ہر دن کی موت سے رفعت لئے ہوئے ہے اور سارے وجود اور ساری فطرت کے گرد گھوم رہی ہے اور پھر اسی عالم میں کہ ان کی فکر اور ان کے احساس کا پنچھی کائنات میں محو پرواز ہے، ان کا وجدان اور ان کی حساس روح، اس اسیر یا ذمی یہودی عورت کیلئے تڑپتی ہے جس پر دشمن نے ان کی حکومت میں ستم ڈھایا ہے اور یہ محنت کش طبقہ کیلئے اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہی اعلیٰ سطح والی فکر کہ جو دنیا میں حکمت کے بلند ترین مفاہیم کو اجاگر

کرتی ہے اور یہی انگلیاں کہ جو اعلیٰ ترین نظم و نثر کی خلاق ہیں، مکہ اور مدینہ کی روڑوں بھری زمین میں ایک مزدور کی طرح کنواں کھودتی ہیں، کھیتی باڑی کرتی ہیں، بوجھ ڈھوتی ہیں۔ پوری تاریخِ عالم میں اس طرح کے محنت کش طبقے کی مثال آپ کو اساطیر میں بھی نہیں ملے گی۔

یہ وہ خود ہے، یہ اس کا گھرانہ ہے اور یہ بھی اس کے دشمن ہیں۔ اس کے دشمنوں کی ساری پلید صفیں طولِ تاریخ میں اس کے مقابل ایستادہ ہیں؛ اور وہ تھوڑی نہیں ہیں، نہ بہ اعتبار نوع اور نہ بہ اعتبار کمیت۔ حق کے مقابل جتنی بھی برائیاں، پلیدیاں، بے شرمیاں، ناراستیاں اور بدصورتیاں، اٹھ کھڑی ہوئی ہیں، وہ ان تین محاذوں سے باہر نہیں ہیں: یا وہ جرائم پیشہ، ظالم اور قسم خوردہ کھلے دشمن ہیں جو اسلحہ سے لیس حق سے لڑنے آتے ہیں۔ یا وہ بدنصیب، جاہل اور مفلوک الحال عوام ہیں کہ جو خود زندان میں ہیں مگر اپنے زندانبان اور اپنے دشمن کے نجات دہندہ کے مداح بنتے ہیں، (جاہل قوم کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ دشمن کی سازش، دشمن کے وسوسے اور دشمن کے فریب سے دوست کے مقابل آجاتے ہیں) اور تیسری قسم ان ہمدردوں، ان ہمراہوں ان ہم فکروں، ان ہمنوائوں اور ان ہم دینوں کی ہے کہ جو حق کے ساتھ، حق پرست کے ساتھ اور اس انسان کے ساتھ کہ جس نے راہ حق میں اپنی زندگی وار دی، ہمگام ہیں، اسے مانتے ہیں، جانتے ہیں کہ کیا چیز اسے دکھ دے رہی ہے، جانتے ہیں کون کون دشمن ان سے دشمنی کر رہے ہیں جانتے ہیں کہ وہ اتنے

دکھ، اتنی تہمتوں اتنے تیروں اور اتنی تکلیفوں کو کیوں جھیل رہا ہے، وہ اس کے دشمنوں کو جانتے ہیں اور اپنے دوست کی راہ و روش اور اس کی شخصیت سے بھی اچھی طرح واقف ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں لیکن آدھے راستے میں ذاتی فائدے، خود غرضی مفاد پرستی، اور حق کے سنگین بوجھ کو مزید نہ اٹھا سکنے کی خاطر، دغا دیتے ہیں یہ دغاباز ہیں اور الگ ہو جاتے ہیں۔

یہ الگ ہونا بھی ہزار طرح کا ہے: یا وہ الگ ہو کر دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں یار کاوٹیں کھڑی کرتے ہیں یا مدمقابل دشمن، کی صفوں میں چلے جاتے ہیں اور علیؑ کا ٹکراؤ ان تینوں محاذوں سے رہا ہے: بنی امیہ ان کے منہ در منہ آنے والے دشمن ہیں؛ طلحہ اور زبیر ان کے حلیف ہیں، انہوں نے علیؑ کو رائے دی ہے، وہ ان کے دوست ہیں، بنی امیہ کے مقابلہ پر علیؑ کے ساتھ ہیں لیکن آدھے راستے پر علیؑ کی سخت اور بھاری عدالت کو دیکھ کر ان سے الگ ہو جاتے ہیں مگر الگ ہو کر وہ کوئی خانقاہ یا گوشہ زہد اختیار نہیں کرتے بلکہ علیؑ کے خلاف سازش کرتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح علیؑ کے دشمن کرتے ہیں۔

اور سب سے بدتر جمل ہے: ان میں سادہ لوح لوگ، متعصب لوگ، بے شعور لوگ اور وہ افراد ہیں جو کسی بات کا تجزیہ نہیں کر سکتے، تحقیق نہیں کر سکتے، صرف افواہوں کو اپنی قضاوت، اپنا دین اپنا ایمان اور اپنا نظریہ بناتے ہیں اور اپنے اعتقادات کو ہوا سے ــــ اور وہ بھی اس ہوا سے کہ جسے دشمن اڑاتا ہے اور اس میں اس کی ساری افواہیں، ساری تہمتیں، سارے اظہارِ

خیال اور ساری قضاوتیں بھری ہوتی ہیں ـــــ لیتے ہیں: ان میں قوت تشخیص اور قوت تمیز نہیں ہے، یہ لوگ دوست اور دشمن کے محاذ میں تمیز نہیں کر سکتے۔ انہوں نے سمت کھو دی ہے۔ یہ لوگ اس بھیڑیے کے ہاتھ کے نیچے رام ہیں جس نے گڈریے کا لباس پہن رکھا ہے اور یہی نہیں بلکہ اس گلہ بان کے خلاف جمع ہوتے ہیں جو ساری عمر ان کی نجات کیلئے اس بھیڑیے سے لڑتا رہا ہے: خوارج

علی ان تینوں محاذوں سے لڑتے ہیں: صفین، نہروان اور جمل۔ اور ان تینوں محاذوں پر یہ تین طاقتیں ہیں: دغاباز دوست، منہ در منہ آنے والا ظالم اور بدکار دشمن، اور وہ متعصب عوام جو آگاہی اور شعور سے عاری ہیں اور دوست کو اجاڑنے کیلئے دشمن کے ہاتھ کا کھلونا بنے ہوئے ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ علی بالآخر تیسرے گروہ کی تلوار سے مارے جاتے ہیں۔ حتیٰ علی کی موت درس ہے۔

اور علی کے پیروکار: کتنی بڑی مصیبت ہے کہ ان میں بنی امیہ کی طرح کے لوگ بھی ہیں اور ناکثین کی طرح کے بھی اور طلحہ، زبیر اور جمل والے بھی ـــــ ہم خیال لوگ، ہمدین حضرات اور وہ ساتھی بھی جو مطلب اور خود غرضی کی خاطر دغابازی سے کام لیتے ہیں ـــــ اور خوارج کی طرح کے افراد بھی ـــــ وہ افراد کہ جنہوں نے اپنی سمت کھو دی ہے اور جو رہ رہ کر وہی جملے بولتے ہیں جنہیں دشمن ان کے حلق میں اتارتا ہے۔

اور شیعہ قوم، علی کے بڑے دکھوں میں سے ایک دکھ ہے: علی اپنی

موت کے بعد اپنی زندگی کے زمانے سے زیادہ بارآور حیات کے حامل ہیں اور میں نے اپنی کسی تقریر میں کہا ہے کہ: علی اپنی موت کے بعد موت سے پہلے کے دکھوں سے زیادہ بڑے دکھ سے ہمکنار ہیں۔

ہمیں چاہئے کہ ہم ان کے دکھ کو دور کرنے اور ان کے درد میں کمی لانے کے لئے کوئی قدم اٹھائیں، کچھ کریں، اور آپ جانتے ہیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہئے: آج اگر کوئی کہتا ہے کہ پتہ نہیں کیا کرنا چاہئے پتہ نہیں ہم کیا کر سکتے ہیں؟ پتہ نہیں ہم کونسی خدمت انجام دے سکتے ہیں تو وہ اپنے آپ سے اور دوسروں سے جھوٹ بولتا ہے، کیونکہ ہر کوئی کم و بیش جانتا ہے کہ کس طرح کوئی کام کیا جا سکتا ہے اور وہ خود کیا کام کر سکتا ہے؟

بہر حال آج کی رات غم کی رات ہے، سوگ کی رات ہے ـــــ علی کے سوگ کی نہیں اپنے سوگ کی ـــــ دکھ کی رات ہے۔ اس کے ساتھ ایک یاد وابستہ ہے کہ جو روح کو تڑپا رہی ہے اور اسی بنا پر دوسرے مسائل کی طرف توجہ مقدور نہیں۔ جان و دل میں ایک اضطراب کی کیفیت طاری ہے، آپ سب لوگوں کے چہروں پر اور مجلس کی اس فضا میں ایک خاص بے چینی، ایک خاص تڑپ اور ایک خاص گرمی کا احساس نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے سوچا، کچھ اور کہنے کے بجائے اگر آپ اجازت دیں تو میں علی کے پوتے اور ہمارے پیشوا امام سجادؑ(۱) کے مکتب و زبان و روش

۱۔ وہ جن کی سرنوشت ہم سے بہت ملتی جلتی ہے، جو نہ ہماری طرح لڑ سکتے ہیں اور نہ موت کو گلے لگا سکتے ہیں۔ وہ ہستی کہ جن سے بولنے، رونے اور فریاد کرنے کا حق بھی چھین لیا گیا ہے۔ وہ جو کربلا کے واقعہ کے بعد اکیلے رہ گئے، اپنے شہر میں اجنبی

و بیان سے، اور ان کی تقلید میں اور ان کی سرنوشت سے تشابہ و ہم آہنگی کے عنوان سے ایک متن کو جسے آپ نے شاید "امام سجادؑ کی درسگاہ دعا میں آگہی عشق حاجت اور جہاد" نامی کتاب میں "دعا" کے عنوان سے پڑھا ہے اور جسے میں نے ان کی جت، ان کے طریقے اور ان کے فلسفہ دعا کے انداز میں لکھا ہے اور جس میں آگاہی، نیاز، عشق، اور جہاد کا فلسفہ ہے، آپ کے سامنے پیش کروں۔

دعا، طول تاریخ میں ہر مذہب کے اندر، اپنے معشوق، معبود اور عظیم خدا کے آگے انسان کے عشق و نیاز کی تجلی رہی ہے۔ لیکن اسلامی دعاؤں کے متن میں ایک تیسری بُعد کا اضافہ ہوا ہے: آگاہی، حکمت اور سوچ۔ تاہم امام سجادؑ نے اس میں ایک چوتھے بُعد کا اضافہ کردیا ہے: جہاد، مبارزہ، جدل، کشمکش اور دعا میں تمام لوگوں کے دکھوں کا انعکاس۔

اسی لئے مطمح نظر دعا، چار ابعاد کی حامل ہے۔ ایک ایسے مکتب اور ایک ایسے درس کے ساتھ جسے انہوں نے دعا کیلئے ہمیں سکھایا ہے اور ایک ایسی رات اور ایک ایسی کیفیت کی مناسبت سے جو آپ سب پر طاری ہے میں آپ سے اس متن کو پڑھنے کی اجازت چاہونگا، اس لئے کہ اب کوئی اور بات مجھ سے ہو نہیں سکتی اور میرا خیال ہے کہ آپ لوگوں کو بھی کچھ اور سننے کا یارا نہیں ہے: (چونکہ یہ متن "امام سجادؑ کی درسگاہ دعا میں آگہی، عشق، حاجت اور جہاد" نامی کتاب میں چھپ چکا ہے اور طویل بھی ہے اس لئے ہم دوبارہ اس کے چھاپنے سے منصرف ہوتے ہیں)

⌘⌘⌘⌘⌘

ہوگئے اور سوائے اسکے، ان کے پاس اور کوئی چارہ، اور، اور کوئی راہ نہیں رہا کہ وہ اپنے سارے عقدوں، سارے دکھوں، سارے احساسات اور ساری آرزوؤں کو خدا سے عرضداشت کریں اور اس کے حضور فریاد بلند کریں۔

Ali and History

ڈاکٹر علی شریعتی

تاریخ اور علیؑ

مترجم: سیّد محمد موسیٰ رضوی

اے تاریخ!

وہ آدمی کہ جو ایک ہزار ایک سال پہلے آدھی راتوں کو چھپ کر شہر سے باہر آتا تھا اور اطراف کے نخلستانوں میں تنہا بیٹھ کر روتا تھا اور چونکہ اس کا سینہ فریاد سے پھٹ رہا ہوتا تھا، نالہ کی شدت حلق میں پھندا لگا رہی ہوتی تھی اس کا سانس لینا مشکل ہو رہا ہوتا تھا، وہ پست کانوں کے خوف سے کنویں میں سر دے کر اپنے عقدوں اور دل کے پھپھولوں کو آزاد چھوڑتا تھا اور اپنے دکھوں کو کنویں میں انڈیل دیتا تھا اور پھر اسے آسودگی حاصل ہوتی تھی، وہ ہلکا ہو جاتا تھا اور اس پنچھی کی طرح جو اپنے آشیانے اور اپنے بچوں کے پاس سے لوٹتا ہے، خالی پوٹے کیساتھ، پھر دانہ چگنے، درد کے دانے چگنے کیلئے ...... خلیفہ کے شہر میں واپس لوٹتا تھا، اب بھی تنہا ہے۔

چاند، یہ بے درد اور بے روح تماشائی مدینہ کے نخلستانوں کے آسمان کی بلندی سے اس انسان کو اپنی سرد آنکھوں اور لاتعلقانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ آسمان، یہ چکی کا بھاری پتھر جو انسانوں کے سروں پر گھوم گھوم کر انہیں پیس رہا ہے اور ہر اس دانے کو جو جسامت میں بڑا اور سخت تر ہے زیادہ وحشیانہ انداز میں ہر کسی سے پہلے چورا کر رہا ہے، پیس رہا ہے، اسی طرح

دیکھ رہا ہے، اسی طرح گھوم رہا ہے اور اسی طرح علیؑ کو تاریخ کے نخلستانوں میں باغات کی منڈیروں کے درمیان ہر سال اور ہر شہر کے باغ میں تنہا دیکھ رہا ہے۔

اب کوئی علیؑ کو دشنام نہیں دے رہا ہے۔ کوئی برے الفاظ اپنی زبان سے نہیں نکال رہا ہے۔ اب ان کا نام اللہ اور رسول اللہ کے نام ساتھ مسجد کی مینار سے بلند ہو رہا ہے، اور علیؑ کہ جو ہمیشہ خلیفہ کی اذان کی آواز کو اس مینار سے سنتے چلے آ رہے تھے، اب دیکھ رہے ہیں کہ ہر صبح و ظہر و عصر و مغرب و عشا کو ان کا نام اللہ کی معبد کے مینار سے اللہ کے بندوں کو سنایا جا رہا ہے۔

تاریخ تعجب سے اس مینار کو دیکھ رہی ہے، اسے یقین نہیں آ رہا ہے، بھلا کس طرح مسجد کا وہ مینار جو خلیفہ کے پنجوں میں ہے، شب و روز، شہر کے بیچوں بیچ، لوگوں کے سروں پر، آسمان کے "نیلگوں" گنبد تلے آواز بلند کر رہا ہے اور دل کی گہرائی سے پکار رہا ہے: "میں گواہی دیتا ہوں کہ علیؑ میرے مولا، میرے پیشوا، اللہ کی حجت اور اہل ایمان کے امیر برحق ہیں"! کیا علیؑ کو فتح حاصل ہوئی ہے؟

تاریخ! کیوں اپنے لبوں کو افسوس سے اپنے دانتوں میں بھینچ رہی ہو؟ کیوں تمہارے چہرہ پر اچانک، تاریک اندوہ کا ایک بھاری سایہ پڑ گیا ہے؟ کیا تمہارے کانوں میں مسجد کی آواز نہیں آ رہی ہے؟ کیا تم نہیں دیکھ رہی ہو کہ ہر صبح، ہر دن، ہر مغرب اور ہر شام کو معبد کے منارے

کے ہونٹ، علیؑ کے نام سے کھلتے ہیں اور کس طرح علیؑ کے نام پر موذن دل کی گہرائی سے آواز بلند کرتا ہے کہ مسجد کا مینار اور اس کے درو دیوار لرز اٹھتے ہیں؟ کیا تم نہیں سنتی ہو کہ علیؑ کا نام محراب مسجد سے بلند ہوتا ہے، مینار کے گلے میں گونجتا ہے اور فضا میں پھیل جاتا ہے؟

لیکن تاریخ تم متردد ہو!

کہتی کیوں نہیں، کہو! اس لئے کہ اس دردناک سرگزشت کے بارے میں تم ہر کسی سے بہتر واقف ہو

تاریخ! علیؑ، سقراط کی طرح دنیا کو عدالت کی جستجو اور حقیقت کی تلاش میں دیکھتے تھے۔ سقراط کہتا ہے، اس دنیا میں یعنی اس سے پہلے کی دنیا میں، ارواح سیبوں کی طرح تھے۔ دیوتاؤں نے ان سیبوں کو بیچ سے دو کر دیا اور پھر ان کے آدھے ٹکڑوں کو وہاں سے اس دنیا میں، اس سطح زمین پر لڑھکا دیا اور وہ زمین پر بکھر گئے اور اسوقت سے یہ یہاں حیران و پریشان گھوم رہے ہیں اور ہر آدھا ٹکڑا اپنے گمشدہ آدھے ٹکڑے کی تلاش میں ہے اور جب تک وہ اپنے دوسرے آدھے ٹکڑے کو نہیں پائے گا چین سے نہیں بیٹھے گا اور اپنی مضطربانہ جستجو میں ہر جگہ دوڑتا پھرے گا تاکہ جونہی وہ اپنے گمشدہ حصے کو، نصف سیبوں کے بے شمار انبوہ میں پائے اس سے ملحق ہو جائے اور پچھلی دنیا کی طرح کا سیب پھر سے نمودار ہو۔ اس طرح سے دو نیم سیب ایک ہو جائیں گے اور یوں نقصان، کمال سے، اضطراب، اطمینان، سے، پریشانی، رضایت سے، تشنگی، سیرابی سے اور بالآخر

حرکت سکون سے بدل جائے گا۔

اور علیؑ خود کو سیب کا نصف سمجھتے تھے اور اپنے حق کو سیب کا دوسرا نصف، اور انہیں یقین تھا کہ ایک سیب کے دو ٹکڑے، اِس ایک سیب کو، اُس دنیا میں تجدید کی منزل پر لائیں گے۔ اور علیؑ ہر کسی کو سیب کا آدھا ٹکڑا سمجھتے تھے اور جو چیز اس کے لئے مناسب اور شائستہ تھی وہ سیب کا دوسرا ٹکڑا تھا جس کی جستجو میں وہ تھا۔ اور یہ وہی جستجو ہے جس کا سقراط معتقد تھا اور کہتا تھا یہ سنتِ طبیعت اور ناموسِ خلقت ہے اور اس رو سے وہ بلاشبہ اپنے دوسرے ٹکڑے کو پالیگا۔

علیؑ اپنے آپ کو سیب کا آدھا حصہ، اور ولایت (بہ معنائے حکومت برحق اور نیز بمعنائے دوستی، سرپرستی، اور آقائی ہے کہ جو خلافت کے جائے کہ جس میں غاصبانہ تسلط کا مفہوم آتا ہے، علیؑ کی حکومت کیلئے اصطلاح حق ہے) کو اپنا دوسرا حصہ سمجھتے ہیں کہ جو فطری طور پر ایک دوسرے کو پائیں گے اور ایک سیب کی صورت میں جس میں وہ پہلے تھے اور جس طرح انہیں ہونا چاہئے تھا نمودار ہونگے۔

مگر ہم نے دیکھا کہ سقراط کے سیب کی داستان اور وہ باتیں جو اس سیب کے فلسفے میں کہی گئی ہیں وہ سب مہمل اور دور افتادہ تھیں۔

عباسؑ، اس عالم میں کہ علیؑ گھر میں جناب رسالتمآبؐ کی میت کے امور میں مصروف ہیں اور اپنے ایمان و افکار و احساسات و اعتقادات کی دنیا میں کھوئے ہوئے ہیں اور کسی دوسری طرف ان کی توجہ نہیں ہے اور

اپنے حق سے بھی غافل ہیں، ان کا ہاتھ پکڑ کر کہتے ہیں: میں دیکھ رہا ہوں کہ کچھ ہاتھ خلافت کے گریبان پر پنجہ ڈالنے کے لئے دراز ہو گئے ہیں اور اس بات کا ڈر ہے کہ وہ تمہیں تمہارے حق سے محروم کر دیں، اپنا ہاتھ بڑھاؤ تا کہ میں تمہارے ہاتھ پر بیعت کروں اور اس بات کی گواہی دوں کہ اس امت پر رسالتمآبؐ کی خلافت و ولایت کا حق صرف تمہیں حاصل ہے۔ علیؑ نے نہایت اطمینان اور تعجب سے کہا، کیا کسی دوسرے کی نظریں اس پر لگی ہوئی ہیں؟ یہ کہہ کر پھر وہ اپنے پاکیزہ افکار و ایمان کی طاقتور موجوں میں گم ہو گئے اس یقین کے ساتھ کہ ان کے سیب کا آدھا ٹکڑا خود انہیں ڈھونڈ لیگا ......

اور ہم نے دیکھا کہ انہوں نے نہیں ڈھونڈا اور نہیں پایا، یا شاید ڈھونڈا اور نہیں پایا اور دیکھا کہ جس طرح، سیب کے اس ٹکڑے کو جو علیؑ کی جستجو میں تھا اور جو اصحاب اور مہاجر و انصار کے اجتماع میں اپنے دوسرے ٹکڑے کا متلاشی تھا، کتنی آسانی سے چھپر (سقیفہ) تلے گھسیٹا گیا اور غیر معمولی عجلت اور تردستی سے غصب کیا اور حضرت ابوبکر کے ساتھ علیؑ کے نصف سیب کے جوڑنے خلیفہ نامی ایک سیب کو اجاگر کیا کہ جس کی نادرستی اور ناراستی شروع ہی سے اہل نظر کے سامنے آئی اور جوں جوں دن گزرتے گئے زیادہ لوگوں پر عیاں ہوئی، یہاں تک کہ ہم نے دیکھا کہ کیا ہوا، امت کس سرنوشت سے دوچار ہوئی۔ اسلام کا کیا حشر ہوا، قرآن کس طرح گنگ ہو گیا، وحی کا دریچہ کس طرح بند ہو گیا، اور وہ سرسبز و

شاداب نوخیز پودا کہ جس پر ہر روز ایک نیا کونپل ایک نیا غنچہ، ایک نئی جست رونما ہو رہی تھی اور جو ہر آن بالیدگی، توانائی اور تناوری پا رہا تھا کس طرح پھل سے پہلے زوال میں آگیا اور اس کے پتے زرد ہو گئے۔

اور علیؑ نے دیکھا کہ کیا ہوا اور سب نے دیکھا کہ وہ سیب جو "سقیفہ بنی ساعدہ" کے چھپر تلے جڑا تھا وہ نہ صرف یہ کہ دو سیبوں کے دو نصف ٹکڑے نہیں تھے بلکہ ان میں سے ایک سیب اور دوسرا آلو تھا اور جو بھی اسے دیکھتا تھا وہ سقراط کی معصوم اور طفلانہ سادگی اور خوش بینی پر ہنستا تھا!

اب علیؑ کیا کریں؟ یا تلوار سے اس نصف کو جو چند ایک چالاک اور مفاد پرست سیاست مداروں کے فریب اور ان کی ماہرانہ پیش قدمی سے "ایک" ہو گئے تھے جدا کریں اور اس غاصبانہ پیوند کو کاٹ دیں جو سقیفہ میں جوڑی گئی تھی، اور پہلی بار تلوار کو درمیان میں لائیں اور اپنی ذوالفقار کی اس طاقت سے کہ جو میدان کارزار میں دشمنوں کو گندم کی تیار کھیتی کی طرح کاٹ کر تلے اوپر ڈالتی تھی اپنے آدھے حصے کو حاصل کریں، یا نہیں، صبر کریں، برداشت کریں، تماشا کریں، خانہ نشینی اختیار کریں، سیاست و زندگی کے میدان سے الگ ہو جائیں۔ اسلام کو خلیفہ کے ہاتھ واگزار کریں اور خود نخلستانوں میں تنہا ڈولتے پھریں، خاموشی اختیار کریں، مسکرائیں، پرسکون رہیں، اور جب درد کے طوفان سے اس طرح اکھڑ جائیں کہ ان کا فولادی صبر بھی ہار جائے تو تیزی سے شہر اور شہر کے لوگوں سے دور اپنے آپ کو کسی کنویں کی منڈیر تک پہنچائیں اور سینہ

تک کنویں میں سر دے کر فریاد کریں، بولیں، روئیں اور جب ان کا طوفان صبر کی نوازش سے تھم جائے تو واپس شہر لوٹیں، بیعت پر مجبور کر دیئے جائیں اور اسلام پر خلافت کو اس طرح دیکھیں گویا اسلام سیب کا ایک نصف اور خلیفہ آلو کا ایک نصف نہیں، بلکہ جو چیز سقیفہ میں ایک دوسرے سے جڑی بلکہ جوڑی گئی وہ ایک سیب ہے، وہ سیب جو اس سے پہلے والی دنیا میں رہا ہے! اور (علیؑ) آلو کی ساتھ اپنے جوڑ کا انکار کریں گویا ایسا ہوا ہی نہیں ہے گویا وہ اس سے واقف ہی نہیں ہیں...... یعنی وہ جانتے ہی نہیں ہیں، ایسا کچھ ہوا ہی نہیں ہے، وغیرہ۔

لیکن یہ بہت سخت مرحلہ ہے! ذرا بتاؤ، علیؑ کو کیا کرنا چاہیے، علیؑ کیا کریں؟ ذوالفقار یا صبر؟

لیکن علیؑ نے صبر کیا، علیؑ نے صبر کیوں کیا؟ کیوں اپنی شمشیر بران کے دم سے اپنے نصف کو، اس نصف کو کہ جسے خدا اور رسولؐ اپنا گردانتے تھے اس دوسرے نصف سے جدا نہیں کیا جسے سقیفہ بنی ساعدہ کے چھپر تلے جوڑا گیا تھا؟ اور نہ صرف یہ کہ جدا نہیں کیا بلکہ انہوں نے اس "گٹھ جوڑ" کا کہ جو سیاست کے ہاتھوں چھپر تلے رونما ہوئی اور علیؑ اس سے واقف نہیں تھے اور اس میں اصحاب رسولؐ اور مہاجروں کی شرکت بھی نہیں تھی، اتباع بھی کیا۔

علیؑ کی بیعت اور ان کی صبر کی داستان کی کیا خوب تمثیل کی گئی ہے: ایک عورت نے کسی ماں کا بچہ اٹھا لیا تھا۔ ماں، قاضی کے پاس

اپنی شکایت لے گئی۔ قاضی نے اس عورت کو طلب کیا۔ بچہ قاضی کے سامنے لایا گیا۔ قاضی بڑا ہوشیار تھا، اس نے کہا: جلاد اس بالک کو بیچ سے دو کر دو اور آدھا اِسے اور آدھا اُسے دیدو تاکہ انصاف کا بول بالا ہو اور ان میں سے کوئی محروم نہ رہے...... عورت خاموش رہی ...... مگر ماں چیخ اٹھی اور اپنے آپ کو بچے پر گرا دیا اور عدالت کے سامنے بچے کو غاصب ماں کی گود میں ڈال کر اس کیفیت کے ساتھ کہ کلیجہ منہ کو آرہا تھا اور درد اس کی آواز کو منقطع کر رہا تھا کہا: نہیں! یہ بچہ میرا نہیں، اس عورت کا ہے!

اگر علیؑ، اسلام کو تلوار کے ساتھ خلافت کے پنجے سے نکال لیتے، خلیفہ کو مُستحکانہ قیام کے ساتھ بھگا دیتے اور سقیفہ میں ڈالے ہوئے جوڑ کو تیغ سے الگ کر دیتے تو اسلام بھی پامال ہو چکا ہوتا، حضرت عثمان خلافت سے راندہ ہوتے لیکن علیؑ نیز اس کی جگہ نہیں لیتے، اور جو کچھ تھا سب برباد ہو جاتا، اور یہ وہ حقیقت ہے کہ جو کوئی ایک تاریخ داں، ایک سیاست بیں اور ایک ماہر سماجیات کی نظر سے اسے دیکھے گا بات کی تہ تک پہنچ جائے گا۔ اور بعد کو تاریخ نے بھی اس بات کی گواہی دی کہ وہ تُندرَو اور متعصب شیعہ جو حتی الوہیت کی حد تک علیؑ کے معتقد تھے جیسے عبداللہ بن سبا اور نیز خوارج کہ جو علیؑ کو ان کے صبر، ان کی خاموشی، ان کے ہتھیار ڈالنے اور ان کی خانہ نشینی کے سبب شدت سے ملامت کرتے تھے، غلطی پر تھے، حالانکہ وہ دیکھ چکے تھے کہ بدر و احد و خیبر و حنین وغیرہ کی گھمسان کی لڑائیوں میں علیؑ بقول تاریخ: "گرد آلود اونٹ کی طرح ہر سمت دوڑتے

اور حملہ آور ہوتے تھے" اور دشمن کی تلے اوپر آنے والی فوج کو گندم کی تیار کھیتی کی طرح اپنی تیغ دودم سے کاٹ کاٹ کر آگے بڑھتے تھے اور ہمیشہ شہادت کے پیاسے تھے اور جب بھی جہاد سے واپس لوٹتے تھے یہ غم انہیں لاحق رہتا تھا کہ شہادت کی سعادت سے محروم رہے اور جناب رسالتمآبؐ کے حضور اس کی شکایت کرتے تھے اور جناب رسالتمآبؐ ان کی دلجوئی کرتے تھے، ان کی امید بندھاتے تھے، انہیں مطمئن کرتے تھے اور خونی موت سے محروم رہنے کے اندوہ و ہراس کو ان کے دل سے دور کرتے تھے......اور وہ لوگ بھی کہ جو موت سے اس طرح کا عشق رکھنے والے اور جنگوں میں پلنے بڑھنے والے کو اپنے حق کے غصب پر جانکاہ صبر کی خاطر ڈرپوک اور سست ارادے والا شخص کہتے تھے حد درجے منصفی سے دور تھے اور شدت سے علیؑ کو تکلیف پہنچاتے تھے اور خود انہوں نے اس شخص کے جواب میں جس نے انہیں سست عنصر اور ستم پذیر کہا، اس لہجہ میں کہ جس میں بہت سی باتیں، بہت سی کیفیتیں، بہت سے معانی، بہت سے دکھ اور بہت داستانیں نمایاں تھیں، کہا:

کوئی ظلم تسلیم نہیں کرتا سوا دو ذلیلوں کے: ایک قبیلہ کا گدھا(۱) اور دوسرا طویلہ کا کھونٹا۔

۱۔ جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ جب کوئی شخص مرتا تھا تو اس کی سواری کو بھی اس کی قبر پر باندھ دیا جاتا تھا تا کہ وہ بھی اپنے مالک کی مٹی پر جان سے گزرے۔ اور قبیلے کے گدھے کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جب قبائل سفر کرتے تھے تو ان کے گلے کے درمیان ایک گدھا بھی ہوتا تھا کہ جس پر ہر کوئی اپنا سامان لادا کرتا تھا، اور سوائے تحمل کے اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

گدھا، اس رسی کی خاطر جو اس کے گلے میں ڈال کر اسے کھونٹے سے باندھا جاتا ہے اور کھونٹا اس لئے کہ اس کے سر پر ہتھوڑے مارے جاتے ہیں اور وہ کچھ نہیں کر سکتا۔

بھلا کس طرح ایک ایسے شخص کو جس نے اپنی ساری عمر بڑے بڑے دشمنوں کے خلاف جنگ میں گزاری ہو اور لوگوں کے حقوق کی خاطر موت سے نہ گھبرایا ہو، اب ایک ایسا آدمی سمجھا جائے جو اپنے حقوق کیلئے خلیفہ سے ڈرتا ہو اور صبر و سکون و گھر بیٹھنے کو اپنے امن اور اپنی سلامتی کی پناہ گاہ اور اپنے خوف اور اپنی کمزوری چھپانے کا بہانہ بنا لیا ہو؟ کیا علیؑ کے بارے میں ایسا فیصلہ، دور از انصاف نہیں ہے؟

عجیب اتفاق ہے! اس دن سے جب علیؑ نے ابوبکر کی خلافت پر بیعت کی اور صبر، سکوت، اور خانہ نشینی کا راستہ اختیار کیا، اس وقت تک جب حضرت عثمان مارے گئے اور اسلام غاصب خلافت کے چنگل سے آزاد ہوا اور حق، صاحب حق تک پہنچا اور بقول سقراط نصف سیب نے اپنے گمشدہ نصف حصے کو پایا اور عالم ذر کا سیب پھر اسی شکل، اسی رنگ و بو، اور اسی زیبائی میں تجدید ہوا، ٹھیک ۲۵ برس کے عرصے نے اپنی مدت تمام کی۔

جناب رسالتمآبؐ کی رحلت سنہ ۱۱ ہجری میں رونما ہوئی۔ اور اسی وقت علیؑ کا حق بنی ساعدہ کے چھپر تلے بڑی عاجلانہ تردستی کے ساتھ، اچانک اور مبہم صورت میں خلیفہ کے ہاتھوں غصب ہوا۔ لیکن علیؑ نے بارہویں ہجری میں بیعت کی، جب انہوں نے اپنے آپ کو ایک انجام شدہ عمل کے مقابل پایا، اور کوئی چارہ کار دکھائی نہیں دیا اور اپنے احقاق حق کیلئے اور غصب کے عمل کو الٹنے کیلئے، مسلحانہ قیام کو بے ثمر دیکھا اور جان گئے

کہ اسلام کی نجات اور اپنے حق کا حصول کہ جو اسلام پر انکی حکومت و ولایت تھی، سوائے خونریزی، جنگ، پریشانی، اور رنج و الم کے کوئی مثبت نتیجہ نہیں دے گی اور اس گیر ودار (جھگڑے) میں اسلام بھی ناخوشگوار مقدر سے دوچار ہوگا اور وہ خود بھی محروم تر ہوں گے، اور دیکھا کہ اب بہت دیر ہو چکی ہے، مجبوراً بیعت کی اور اسلام پر خلیفہ کی حکومت کو برداشت کیا اور گھر بیٹھ گئے۔ علیؑ کے صبر و سکوت، اور ان کے حق پر خلافت کے تسلط کا زمانہ، حضرت عثمان کے وحشت ناک قتل پر اختتام پذیر ہوا اور یہ واقعہ سنہ ۳۵ ہجری کو رونما ہوا اور یہ وہ سال ہے کہ جس میں علیؑ ۲۵ سال کی خانہ نشینی، تنہائی، سکوت اور غصب پر بیعت کے عمل سے باہر آئے اور اسلام نے خود کو ان کے دامن میں ڈال دیا، اور "علیؑ کی حکومت" ۲۳ سال کے دردآلود، سیاہ، اور خفقان آور انتظار کے بعد روبہ عمل آئی، اور تاریخ کی غبار آلود اور مایوس آنکھیں ۲۳ سال بعد پھر چمکیں اور اس نے علیؑ اور اسلام کو ایک دوسرے کے ہمکنار دیکھا، اور دیکھا کہ علیؑ ۲۳ سال کی خانہ نشینی، اور صبر و سکوت اور اپنے غاصب حق پر بیعت، کے جانکاہ اور بھاری بوجھ کو گھسیٹنے کے بعد اب اسلام کو اپنی آغوش میں دیکھ رہے ہیں اور اسلام ۲۵ سال غاصب خلافت کی زندان میں مقید رہنے اور علیؑ کے آزادانہ دیدار سے محروم رہنے کے بعد اب خود کو علیؑ کی آغوش میں پا رہا ہے، اور ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والے یہ دو نصف "ایک" ہوگئے ہیں۔ یہ وہی دو نصف ہیں جنہیں ۲۳ سال تک ایک ہی شہر، ایک ہی جگہ، اور ایک دوسرے کے قریب رہنے کے باوجود انہیں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے، ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کرنے اور ایک دوسرے کو دیکھنے سے محروم کردیا

گیا تھا، مگر اب جب خلیفہ اپنے بستر پر اپنے خون میں سو رہا ہے یہ دو قیدی رہا ہوگئے ہیں، بنی ساعدہ کی چھت، نیچے گر پڑی ہے، اور "ولایت حق"، "خلافت غصب" کی جگہ، مدینہ پر سایہ افگن ہو گئی ہے اور اس سایہ میں علیؑ اور اسلام نے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے رکھا ہے اور بلا دغدغہ خلیفہ کے حاشیہ نشینوں، جاسوسوں اور مخبروں نے ــــ یہودی الاصل کعب الاحبار، مروان حمار (کتنا مناسب نام ہے)، قمقوز! (خلیفہ کا ملازم) اور دوسروں نے ــــ ایک دوسرے کے لئے اپنی آنکھیں بچھادی ہیں اور گزشتہ یادوں کی تلخیوں کو کہ جو اب اچانک میٹھی ہوئی ہیں مزے لے لے کر چاٹ رہے ہیں اور مستقبل کی آرزوؤں کے نشہ آور شہد کو، کہ جو ایک ربع صدی سے بھاری اور تاریک ناامیدیوں کے زیر خاک مدفون تھا اور اب اچانک نکل آیا تھا اور اب لگ رہا تھا جیسے مدفون امیدوں کی قیامت برپا ہوگئی ہے اور شہید امیدوں کے غمزدہ اور پھیلے ہوئے قبرستان میں اسرافیل نے صور پھونک دیا ہے، بیٹھے چکھ رہے ہیں اور ان گرم اور خوشگوار لذتوں کو دل دے بیٹھے ہیں جو ان کی روح میں دوڑ رہی ہے اور تو شگفتہ پھولوں کی دلپذیر خوشبو ان کے دل و دماغ میں بستی جارہی ہے۔ اور نامرئی لطیف انگلیاں ان کے باطن میں بڑی مدہوش کن نرمی اور مہربانی کے ساتھ ان کی تھکی، رنجور اور نوازش کی پیاسی روح کو نواز رہی ہیں اور بڑا روشن، دلپذیر، اور پراسرار سکون ان کی رگوں میں حلول کررہا ہے اور ...... آہ کہ تاریخ ان دونوں مہربان اور شائستہ ناتہ داروں کو کس مزے سے دیکھ رہی ہے جو برسوں سے اپنی تلخ سرنوشت کی آگ میں جل جل کر جی رہے ہیں اور اب اختتام راہ پر انہیں راہ ملی ہے اور اب وہ اس دہانے پر پہنچ گئے ہیں

جہاں دریا اپنی پیشانی کو بڑی نرمی اور خود سپردگی کے ساتھ سمندر کے ان ہونٹوں پر رکھتی ہے جو اپنے سرگشتہ نووارد کے استقبال کیلئے اس کے انتظار میں ہیں۔

تعجب کا مقام ہے، شیعہ نہج البلاغہ کو کیوں نہیں پڑھتا؟ ٹھیک ہے کہ علیؑ کا شعری دیوان بھی ہے۔ وہ ایک دانا خطیب بھی ہیں اور قادر الکلام شاعر بھی۔ میں ان بہت سے محققین کے برخلاف جو علیؑ سے منسوب موجودہ اشعار کا انکار کرتے ہیں اور ان کو علیؑ کے مقام، علیؑ کی روح اور ان کی خاص شخصیت کے موافق نہیں سمجھتے، اس بات کا معتقد ہوں کہ یہ سارے اشعار علیؑ کے ہیں اور شعر کو علیؑ کی شخصیت سے جدا نہیں سمجھتا(۱) اور جو لوگ اس طرح سمجھتے ہیں انہوں نے علیؑ کو ان کے کئی بُعدی والے سارے جلوؤں میں نہیں دیکھا ہے اور کون ہے جس نے علیؑ کو ان کے سارے ابعاد

۱۔ ان سے منسوب دیوان اشعار ابھی موجود ہے اور اسے شریف رضی نے جمع کیا ہے اور مصر و عراق میں اس کی بارہا اشاعت ہوئی ہے، اور ابھی حال ہی میں عراقی دانشمند آقای محمد ہاشم جواد نے اسے تصحیح کر کے نئے انداز سے چھاپا ہے، لیکن اکثر علماء اور ادباء، حضرت امیرؑ سے اس کے انتساب کے بارے میں مشکوک ہیں۔ لیکن میں ان کی اس دلیل کو کہ علیؑ جیسی پارسا، مجاہد اور سنجیدہ ہستی کا شعر و شاعری سے کوئی تعلق نہیں ہے، ضعیف اور کمزور سمجھتا ہوں اس لئے کہ میں نے دیکھا ہے اور ان لوگوں کو جانتا بھی ہوں کہ جنھوں نے اپنی عمر کو علم و تقویٰ اور تفکر و جہاد میں گزارا ہے اور وہ انتہائی سخت، سنجیدہ، منطقی اور عقلی چہرے کے مالک ہیں اور انہوں نے طرب انگیز اشعار بھی لکھے ہیں۔ شہزادہ افسر، بہار، دھخدا وغیرہ۔ کیا انہوں نے اس نوعیت کے شعر نہیں لکھے ہیں؟

میں دیکھا ہو؟ حتیٰ وہ علیؑ پرست صحابی بھی نہیں جو ہمیشہ علیؑ کے ساتھ تھا، ہمیشہ علیؑ کے بارے میں سوچتا تھا، جس نے علیؑ کو خدائی مقام تک پہنچایا اور کہا کہ خدا نے علیؑ کے چہرے میں ظہور کیا ہے اور اس بشری روپ میں روح خدا پنہاں ہے۔ وہ کہتا تھا، میں نے اسے دریافت کیا ہے۔ اور علیؑ اس کی ڈینگوں سے پریشان ہوتے تھے، اور جیسا کہ "شہرستانی"، "ملل و نحل" اور اسلامی فرقوں کے دوسرے مورخوں نے لکھا ہے علیؑ نے اسے سزا دی اور آگ میں پھینکا، اور جب اس نے (عبداللہ بن سبا نے) اس ڈھیر ساری آگ کو دیکھا جو اس کے لئے جلائی گئی تھی تو بلند آواز میں کہا سبحان اللہ! یہ وہی آگ ہے جسے تم نے اپنے قرآن میں محمدؐ کو خبر دی ہے اور اب میں اور زیادہ اپنے ایمان میں راسخ ہو گیا ہوں، یہ کہہ کر اس نے علیؑ کے سامنے سجدہ کیا اور آگ میں کود کر جل گیا! لیکن میں اس بات کا معتقد ہوں کہ علیؑ نے اسے مدائن جلاوطن کیا (یہ بات بھی مورخوں ہی نے لکھی ہے) علی اللّٰھی فرقہ کے اس پہلے پیشوا نے علیؑ کی پرستش پر مبنی گرمیٔ اعتقاد میں، اپنے ایمان اور اپنے مکتب کی راہ میں سرگرم جہاد علیؑ کی گفتگو اور ان کے احساسات پر توجہ نہیں دی اور ان جیسا بننے کے بارے میں نہیں سوچا۔ دنیا کے اس پہلے علیؑ شناس اور پہلے علیؑ پرست کہلوانے والے شخص نے ـــ کہ جس پر علیؑ کا جنون سوار تھا، جو اپنی باتوں اور اپنے عمل سے علیؑ کو دکھ پہنچا رہا تھا، کبھی ان کی تحقیر کرتا تھا، کبھی لاتعلقی کا اظہار کرتا تھا، کبھی ان سے دوری اختیار کرتا تھا، کبھی بھاگتا تھا، کبھی چھپ جاتا تھا، کبھی

ظاہر کرتا تھا کہ وہ غلطی پر ہے اور علیؑ کو نہیں پہچانتا اور نہیں پہچان سکتا، اور علیؑ کے بارے میں اس کے اندر جو محسوسات ہیں وہ بصیرت و آشنائی کے لائے ہوئے نہیں ہیں بلکہ وہ ولولہ ہے جو اس کی روح میں نمودار ہو رہا ہے، وہ جنون ہے جو اندھا، بیہودہ اور بے ثمر ہے ـــ جب مجبوراً علیؑ کو چھوڑا اور مدائن میں جلاوطن ہوا تو دریا میں کود کر ڈوب گیا۔

سیاہ خیمے ...... خوفناک ہوائیں اس خیمے سے اٹھتی ہیں

اور سارے خیموں میں دوڑ جاتی ہیں اور ......

اوووہ کتنی باتیں یہاں ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئی ہیں؟!

میرا دل پھٹ رہا ہے!

اب مجھ سے لکھا نہیں جا رہا ہے۔

تشیع کے اصلی سرچشمہ سے شیعہ قوم کی دوری نے، بڑے ناخوشگوار اور دردناک آثار پیدا کر دیئے ہیں، حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ شیعہ اسی ابتدائی دور سے، اسی وقت سے جب سے انہوں نے علیؑ کو پہچانا اور اسلام کی سرنوشت سے آگاہ ہوئے اور سقیفہ کے انتخابات سے واقفیت حاصل کی، اور اسلام کی مکتوم حقیقت، اپنی فضیلت، علیؑ کی حقانیت، اور روح اسلام سے ان کی معنوی، پنہانی، اور عمیق وابستگی سے آگاہی حاصل کی، ایک لحہ کیلئے چین سے نہیں بیٹھے اور علیؑ کی محبت کو اپنی پر کشمکش اور حادثات بھری تاریخ کے دشوار ترین اور خطرناک ترین ایام میں، دل سے دور نہیں کیا، اور اس گیارہویں صدی سے جس میں جناب رسالتمآبؐ کی

رحلت ہوئی اور اسلام، سقیفہ میں، علیؑ کی موجودگی کے بغیر حضرت ابوبکر کی گرفت میں آیا اور حضرت سلمان نے ایک معنی خیز اور دردناک لہجہ میں انتخاب سقیفہ کے ہدایت کاروں سے مخاطب ہو کر کہا:

"کیا اور نہیں کیا" ! (کیا جو تمہیں کرنا تھا اور نہ کیا جو پیغمبر کا منشا تھا)

اسی وقت سے شیعوں کو غصب کا احساس اور اس بہادر انسان پر ایمان مضبوط ہوا جو ۳۳ سال (۱) کی حادثات بھری شجاعانہ زندگی کے بعد خانہ نشین ہوا۔

✠✠✠✠✠

۱۔ علیؑ دسویں سال میں، بعثت سے پہلے متولد ہوئے۔ جناب رسالتمآبؐ کے ساتھ ۱۳ سال مکہ اور ۱۰ سال مدینے میں رہے اور اس بنا پر جس سال شیعہ تحریک کی پہلی موج ابھری اس سال ان کی عمر ۳۳ سال تھی۔

علی شریعتی کو سمجھئے

ڈاکٹر علی شریعتی...... حجت الاسلام محمد خامنہ ای کی نگاہ میں

("زن روز" کے حوالہ سے ایک انٹرویو)

س: براہ کرم فرمایئے ڈاکٹر علی شریعتی سے آپ کی ملاقات کتنی پرانی اور کس حد تک ہے؟

ج: میں علی شریعتی کو مشہد میں ہم وطن ہونے کی بنیاد پر اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ ابھی فرانس نہیں گئے تھے۔ میری ان سے بہت پرانی رفاقت و آشنائی ہے اور میں ان کے عقائد و افکار کو بھی اسی زمانے سے جانتا ہوں۔

باہر جانے سے پہلے بھی وہ ایک نڈر اور نقاد شیعہ اور علمی ماحول میں پروان چڑھنے والے ایک جواں سال لڑکے کی صورت تھا۔ اسلام سے دلچسپی کے محرکات کی بنیاد پر ظالم حکومت کی نسبت اس کے شکوے اور اعتراض کو فریاد ہمیشہ بلند رہی۔ باہر کا سفر اختیار کرنے سے پہلے اپنے والد سے بہت زیادہ انسیت کے سبب وہ اسلامی ثقافت و اصول کے گہرے

مطالعے سے بھی بہرہ مند تھا اور ملک سے باہر جانے کے بعد بھی اسلام کی نسبت اس کی دلچسپی اور حمایت میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ اس میں اور زیادہ شدت پیدا ہوئی، وہاں اس نے واقعیتوں کو، خاص طور پر قوموں کی رہبری کے عنوان سے انقلابات میں شیعی علماء کی ضرورت کو واضح طور پر محسوس کیا، اور مغرب میں دنیا کے مختلف افکار و عقائد رکھنے والی عالمی شخصیتوں کے روابط سے اس نے اسلام کی صحیح اور کامل شناخت کے لئے سماجی نقطہ نظر سے ایک نئی بنیاد اجاگر کی۔

ایران واپس آنے کے بعد بھی کم و بیش اس کے نئے افکار و عقائد پر میری نظر رہی اور میں نے ڈاکٹر کے ان بعض نادرست عقائد پر بھی کہ جو علمی اسلامی پہلو کی حامل تھیں تنقید کی۔

س: ان کی شخصیت کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

ج: شخصیت کے اعتبار سے ڈاکٹر شریعتی مثبت خصوصیات کے حامل تھے۔ وہ گٹھ جوڑ اور سازباز کرنے والے آدمی نہیں تھے، اور علمی اور تحقیقی اصولوں میں مغرب کی آراء اور ان کی بات پر توجہ نہیں دیتے تھے۔ ان کا تکیہ صرف اپنے اعتقادی اصولوں پر تھا، وہ تنقید پذیر تھے اور مستند تنقیدوں کی بڑی حد تک پذیرائی کرتے تھے۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ وہ مکتب اسلام کے کامل ہونے کو پایہ ثبوت تک پہنچائیں۔ جناب رسالتمآبؐ اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی نسبت ان کی ارادت خصوصی پہلو کی حامل تھی اور وہ اپنے تجزیوں میں ان ہستیوں کی خصوصیتوں اور مرتبوں کو منظر

عام پر لاتے تھے۔ وہ ایک محقق، ماہر سماجیات اور اسلام شناس ہستی تھے۔

لیکن ان کے بارے میں قائم تصور کے برخلاف ڈاکٹر ایک سیاست مدار آدمی اور ہمہ گیر مبارزات کے اہل نہیں تھے۔ وہ فقط اعتقادی رو سے سرگرم عمل تھے۔ ڈاکٹر بنیادی طور پر ایک شاعر تھے اور ان میں ادبی ذوق کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، اور یہ ان کا حُسن بھی تھا اور عیب بھی۔ اس لئے کہ بعض تحقیقات میں شعری اور ادبی ذوق اور تجزیہ کا زور تحقیقی عمل میں رکاوٹ بنتا ہے اور محقق کو تشبیہ اور سمبل سازی کی طرف لیجاتا ہے، اور بعض اوقات ڈاکٹر کا ذوقِ فراواں یہی صورت اختیار کرتا تھا۔ وہ قلم کے دھنی تھے اور اپنی باتوں کو بڑی خوبی سے بیان کرتے تھے۔ ان کا شمار اسلام شناسی کے بنیادی پایوں میں سے ایک پایہ میں ہوتا ہے۔ اسلام شناسی کے گوناگوں ابعاد ہیں اور اسلام کے دفاع کے بھی مختلف محاذ ہیں اور بہت کم کوئی ایسا ہے کہ جس نے ان تمام محاذوں پر مجاہدت کی ہو۔ علی شریعتی نے بحث و تمحیص اور اسلام شناسی کے محاذ پر تطبیقی اور تقابلی نقطۂ نظر سے کام کیا ہے۔

س: براہ کرم ارشاد فرمائیں کہ انقلاب سے پہلے نوجوان نسل کی بیداری میں ڈاکٹر صاحب کا کردار کیا تھا؟

ج: ڈاکٹر صاحب کی کامیابی کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ تھی کہ انہوں نے ٹھیک اپنے زمانے میں اپنی جگہ پکڑی بالکل اس شئے کی طرح جو اپنے ظرف میں مستقر ہو جائے۔ وہ ایران میں عین اس وقت آئے جب قوم کو ایک مسلمان روشن خیال ہستی کی ضرورت تھی۔ اگر وہ اس وقت سے

پہلے یا بعد ازاں ایران آتے تو ان کے تجزیات اور ان کی باتیں کسی کے لئے قابل قبول نہیں ہوتیں۔ انہوں نے ایران میں اس وقت قدم رکھا جب مغرب پرست مذہب دشمن فضا لوگوں کے اذہان و افکار پر خاص طور سے روشن خیال طبقے پر مسلط تھی۔ ایسی صورت حال میں علی شریعتی کو یہ موقع ملا کہ وہ اسلام کے تطبیقی اور تقابلی تجزیات کے ایک سلسلے کو جاری کر کے دوسرے مکاتب پر اس مکتب کی برتری اور بالادستی کو بدرجہ اتم ثابت کریں۔

جس زمانے میں واقعیتوں تک پہنچنے کے لئے روشن خیال لوگوں کی پیاس انتہا تک پہنچ گئی تھی اور کسی میں یہ طاقت نہیں تھی کہ وہ حوزوں اور قدیمی زبانوں کی راہ سے اس پیاس کو دور کرے اس نے ایک ایسے لہجہ میں کہ جس سے تعصب اور جمود کی بو نہیں آتی تھی، آزاد اندیشی کے ساتھ مغربی طرز پر انہیں پیش کیا اور معاشرے میں اسلام سے لگاؤ کے جذبے کو ابھارا۔ اس طرح شریعتی در حقیقت ایک وسیلہ یا معمارِ راہ تھے کہ جن کے بعد مرحوم مطہری کی طرح حوزہ کے دیگر اسلام شناس علماء، مغربی مکاتیب کو رد کر کے لوگوں کو حقیقی اسلام کی صورت دکھا سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ شریعتی وہ ہستی ہے کہ جس نے بند راستے کو کھولا اور اس کے بعد دوسرے لوگوں نے جن کا شمار حوزہ کے اعلیٰ اسلام شناسوں میں ہوتا ہے اس راستہ کو باقی رکھا۔

س: آخر کیوں اور کس لئے انقلاب سے پہلے ڈاکٹر...... مطہری جیسے

دوسرے صاحبانِ فکر و نظر سے زیادہ قوم اور خاص طور پر نوجوان نسل میں فکری نقطۂ نظر سے مقبول ہوئے؟

ج : اس لئے کہ شہید مطہری کی کتابوں کے مطالب و مفاہیم کا ادراک ان لوگوں کے لئے جن کو اسلام سے واقفیت نہیں تھی مشکل تھا۔ وہ اصیل اسلام کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے اور وہ لوگ جن کا یہ عقیدہ تھا کہ حوزے اور معمم حضرات واقع اندیش نہیں ہیں، ان کا ذہانت سے سروکار ہے، اور وہ یورپ کے تجربی مطالب کو سرے سے نہیں جانتے، وہ مطہری جیسے لوگوں سے صحیح اور فوری طور پر استفادہ نہیں کرسکتے تھے۔ ایسی صورت حال میں ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی کہ جو مغربی دانشمندوں کی زبان اور اس زمانے کے محققوں اور تاریخ دانوں کے تجربات سے واقف ہو، اور اپنی باتوں کو مغرب کے انداز میں مغرب کے خلاف استناد کے ساتھ پیش کرے اور دیگر مکاتیب پر اسلامی ثقافت، اسلامی عقائد و آئیڈیالوجی اور مسلمان شخصیتوں کی ترجیحات کو نمایاں کرے۔ ڈاکٹر شریعتی کا ایسے وقت میں اہم ترین کام یہ تھا کہ انہوں نے نوجوانوں کو اپنے آپ سے باہر نکال کر انہیں شخصیت دی۔ وہ ان پر ثابت کرنا چاہتے تھے کہ مکتب اسلام دیگر مکاتیب سے قابل موازنہ نہیں ہے۔ وہ اسلام کو ان کی سوچ میں بسانا چاہتے تھے۔ میں خود ذاتی طور پر ایسے لوگوں کو جانتا ہوں کہ جن کا اسلام کی طرف معمولی سا جھکاؤ بھی نہیں تھا اور وہ ہمیشہ اس سے دور بھاگتے تھے۔ مگر جب انہوں نے ان کی کلاس میں

شرکت کی تو ان کی بدگمانی قدرے دور ہوئی لیکن افسوس کہ بعد میں ان لوگوں نے ایسا قدم اٹھایا کہ حوزوں کے علماء تک سے آگے نکل گئے اور یہ وہ خصوصیت تھی جو مرحوم علی شریعتی میں بھی تھی اور ان کے پیروکاروں میں بھی آگئی تھی۔ مختصر یہ کہ علی شریعتی کے افکار کی صورت اس طرح ہوگئی تھی کہ وہ لوگوں کو بڑی تیزی سے اسلام کی طرف راغب اور روشن خیال بناسکتی تھی۔

لیکن آج ہماری قوم کو کسی ایسی ہستی کی ضرورت نہیں ہے جو مغربی تمدن پر اسلام کی فضیلت اور اس کی بالادستی کو ثابت کرنا چاہتی ہو۔ آج نوجوانوں کو اسلامی ثقافت کے گہرے ادراک کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب انہوں نے حوزوں کا رخ کرلیا ہے اور اس سلسلے میں مرحوم مطہری جیسے لوگ ہی ان کی ضرورت کو پوری کرسکتے ہیں۔ اور اسی لئے انقلاب کے بعد ہمارے نوجوانوں نے مطہری کی کتابوں میں دلچسپی لینی شروع کی ہے اور ان کی طرف رجوع کیا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ ایک شیر خوار بچے کو ہلکے اور زود ہضم غذا کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب وہ جوان ہوجاتا ہے تو اسے مقوی اور کسی قدر بھاری غذا درکار ہوتی ہے۔ مرحوم مطہری گو کہ علمی تحقیقاتی کام کرنے والوں اور روشن خیال لوگوں کے مرجع تھے لیکن اس زمانے میں وہ لوگ ان کی باتوں کو ہضم نہیں کرسکتے تھے اور اس کا سبب یہ تھا کہ جس زمانے میں انہیں اسلامی تمدن کا مطلق ادراک نہیں تھا بلکہ وہ مغربی تمدن کو اس سے برتر سمجھتے تھے مطہری کی

باتوں کی سمجھ ان کے لئے بھاری اور دشوار تھی۔ اگر اس زمانے میں قوم ڈاکٹر سے اور اب لوگ مطہری سے استفادہ کر رہے ہیں تو اس میں کسی کی کوئی برائی نہیں ہے۔ ان دونوں نے اپنے کردار کو بہت اچھے اور شائستہ انداز میں ادا کیا ہے۔

س: یہ فرمایئے کہ ڈاکٹر صاحب نے کن موضوعات پر زیادہ کام کیا ہے، اور ان کے کن موضوعات میں نقص پایا جاتا ہے؟

ج: ڈاکٹر شریعتی نے سماجیات، تاریخ، فلسفۂ تاریخ اور ادبیات پر زیادہ توجہ دی ہے۔ انہیں نفسیات، سماجیات، اور شخصیتوں کے تحت الشعور اور لاشعور کی تحقیق کی نسبت اپنے تجزیات اور اپنے موازنوں پر پورا کمانڈ حاصل تھا۔ ان کی، فلسفۂ تاریخ کے موضوع پر گفتگو بھی کہ جس میں انہوں نے اپنی کتابوں اور گفتگو میں اشتباہات کو پیش کیا ہے قابل تحقیق اور قابل قبول ہے۔ شریعتی کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ اسلام کو سماجیات کے دریچے سے دیکھتے تھے، اور اس در سے اس کا تجزیہ کرنا چاہتے تھے۔ انہیں فلسفی اور فقہی مسائل، اور تجزیاتی تصریحات سے پوری طرح آگاہی نہیں تھی مگر پھر بھی وہ اس میں دخالت کرتے تھے، یعنی وہ کسی اور دستاویز کو کسی دوسرے مفہوم کی شناخت کے لئے استعمال کرتے تھے جبکہ ہر علم کو اس کی خاص دستاویز اور اس کی مناسب حال روشوں سے جانچا جانا چاہئے، یعنی اگر ہم فقہی مسائل کو فلسفہ کے نقطۂ نظر سے دیکھیں اور اس راہ سے اسے پایہ ثبوت تک پہنچائیں تو پھر ہم اس کو فقہ نہیں کہہ سکتے۔

ریاضی اور عقلی اطوار سے طبیعی علوم کا تجزیہ نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی استقرائی روش کا کسی طریقے سے اور برھانی روش کا کسی دوسرے طریقے سے تجزیہ کیا جانا چاہئے۔

ایسے لوگ بھی تھے کہ جنھوں نے شاہ سے ٹکر لینے کے لئے اسلام کو اپنا ذریعہ بنالیا تھا۔ دراصل انقلاب سے پہلے ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں تھی کہ جو علم اور تکنیک کو ایک دوسرے سے الگ سمجھتے تھے اور اسی لئے انہوں نے اسلام کا رخ کرلیا تھا اور نماز پڑھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اسلام ایک علمی دین ہے۔ چونکہ مغربی تمدن ان کی فکر میں بس گیا تھا اس لئے وہ اسلام کو بھی اسی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ آپ مغرب کے تعلیم یافتہ حضرات کے بہت سے آثار اور شرح و بیان میں اس کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ یہ لوگ اس چیز کو درست سمجھتے تھے کہ جسے تجربہ اور علم سے ثابت کیا جاسکتا ہو۔ یہ سارے افراد اس زمانے میں اسلام کی نسبت حُسنِ ظن اور علم دوستی کی غرض سے ڈاکٹر علی شریعتی کے گرد جمع ہوگئے تھے اور انقلاب کے بعد اس وقت جب تجربہ کی کسوٹی سامنے آئی اور ضروری تھا کہ ولایت فقیہ کی نسبت ارادت سے لوگوں کی اصالت واضح ہو تو ان کی شناخت ہوئی۔ ان کی سیاست، اسلامی اور انقلابی سیاستوں سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ البتہ ان کا ڈاکٹر سے کوئی ربط نہیں تھا اس لئے کہ وہ ہر ممکنہ صورت سے امام کے ارادتمند تھے اور اصیل علماء کا احترام کرتے تھے اور ان کی جلالت و عظمت کے قائل تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک غلطی یہ بھی تھی کہ انہوں نے ایسے مسائل میں نیز دخالت کی جن میں نہ انہیں مہارت تھی اور نہ استعداد۔ وہ ہر گز اس بات کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھے کہ انہیں دینی مسائل میں مہارت حاصل نہیں ہے اور مسلسل دخالت کرتے تھے۔ ان پر مرحوم مطہری کا اعتراض بھی یہی تھا۔ اس زمانے میں مرحوم مطہری کی شرعی ذمہ داری بھی واقعی یہی تھی کہ وہ ڈاکٹر کے علمی اشتباہات کو افشا کریں جبکہ باطنی طور پر وہ انہیں بہت چاہتے تھے اور ڈاکٹر کی واقعاً صحیح باتوں کی تعریف کرتے تھے۔

س: جن لوگوں نے صرف علی شریعتی کی راہ اختیار کی ہے اور کر رہے ہیں اور وہ گروہ بھی جو ان کے نام کے زیر سایہ سرگرم عمل ہے آخر کیوں انحراف سے دوچار ہیں؟

ج: میرا خیال ہے انقلاب سے پہلے کے برسوں میں ایک غلط تصور بعض طبقوں کے درمیان ابھر اتھا۔ یہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ ڈاکٹر علی شریعتی علماء کے خلاف ہے جبکہ ایسا نہیں تھا، سچے اور اصیل علماء سے ان کی رفاقت و دوستی تھی۔ وہ ہمیشہ شیعہ علماء کی تعظیم کرتے تھے۔ لیکن وہ لوگ جو علماء کے مخالف تھے انہوں نے اپنے انحرافی راستوں کے سبب انقلاب کے بعد مخالف گرہوں کی صورت اختیار کی اور ڈاکٹر علی شریعتی کو اپنی پناہ گاہ بنایا۔ یہ سب لوگ اسلامی جمہوری حکومت سے رزم آراء ہونے کے لئے ایک مخالف سیاسی مدار کی تلاش میں تھے اور علی شریعتی سے عقیدت و ارادت رکھے بغیر ان کے گرد جمع اور ان کے جلسوں میں شرکت

کرتے تھے، اور اس عنوان سے کہ شریعتی ایک الگ راہ اور ایک خاص گروہ سے متصل ہیں اپنے آپ کو ان کی پیروی کا پابند سمجھتے تھے۔ اور پھر انہوں نے اپنے لئے مختلف گروہ تشکیل دیئے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایک چیپی یا پیوند تھے جو اپنے آپ کو ڈاکٹر سے چپکا رہے تھے اور ڈاکٹر علی شریعتی حتیٰ ان کی رہبری اور ہدایت کے درپے نہیں تھے ان کا پورا ہدف اسلام کی شناسائی تھی۔ وہ مسلسل اس کوشش میں تھے کہ ان روایتوں کو دھو دیں جو گرد کی طرح اسلام پر بیٹھی ہوئی ہے اور بعض اوقات وہ ان علماء پر بھی حملہ آور ہوتے تھے جو حقیقی اسلام کی راہ سے ہٹ گئے تھے۔ یہ سب حقائق اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی نہ کوئی الگ راہ تھی اور نہ ہی وہ انقلاب کے مخالف تھے۔ اعلیٰ شخصیتوں سے اس طرح کا بیجا استفادہ طویل تاریخ میں مشاہدہ کی منزل پر آتا رہا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے ہمارے ائمہؑ کے نام سے انحرافی منفعت جویانہ سیاسی جماعتوں کی تشکیل کی اور مدتوں حکومت کرتے رہے۔

س: آپ کے خیال میں ڈاکٹر علی شریعتی کے افکار حوزوں میں کس حد تک رائج رہے؟

ج: شریعتی کے افکار دینی علوم کے حوزوں میں خاص کر نوجوانوں کی سطح پر بہت زیادہ نافذ رہے اور میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر علی شریعتی نے حوزوں پر بہترین اثر قائم کیا، اس اعتبار سے کہ دینی علوم پر مبنی حوزوں کے طلباء متاثر ہونے والے لوگ نہیں تھے، اور اسلام کو اچھی

طرح سمجھتے تھے، اور علی شریعتی کی تحقیقات انہیں مدد دیتی تھی کہ اسلام کی شناخت میں ان کا تخصص کامل ہو جائے۔ بنیادی طور پر چونکہ اسلامی مسائل میں وہ ضروری تخصص کے حامل تھے اس لئے ڈاکٹر کی باتوں کو اس حد تک مانتے تھے جس حد تک وہ قابل قبول تھیں اور جہاں کہیں اشتباہ ہوتا تھا وہ اس پر تنقید و تبصرہ کرتے تھے اور اشتباہ کو دور کرنے کے درپے ہوتے تھے۔ مختصر یہ کہ دینی علوم کے حوزوں نے ڈاکٹر علی شریعتی کو ہرگز رد نہیں کیا بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حوزے ہر جگہ سے زیادہ ان کے مطالب کو تبصرہ اور تحقیق کی منزل پر لائے۔ خود میں ایک طالب علم کی حیثیت سے ان کی تقریروں کو سنتا اور ان کے آثار کا مطالعہ کرتا تھا اور دوسروں کو بھی تاکید کرتا تھا کہ وہ ان کو پڑھیں۔ اور ان کی گفتگو کے جو حصے میری نظر میں صحیح نہیں بیٹھتے تھے میں ان پر تنقید کرتا تھا۔

میری نظر میں دو گروہوں نے اشتباہ کیا، ایک وہ کہ جس نے ڈاکٹر علی شریعتی کو ان کے اشتباہات کی بنیاد پر سرے سے رد کیا ہے اور ان کی کسی بات کو قابل قبول نہیں سمجھا ہے، اور دوسرے وہ کہ جنھوں نے ان کی ساری باتوں کو بطور مطلق مانا، اور ان کی پیروی کی ہے۔

Plz recite a Surah Fatiha for Dr. Ali Shariati

طالب دعا:
سید حسین علی نقوی
تسان ضیاء خان
سحر تشبیہ

02/07/09

اللھم صل علی محمد و آل محمد و عجل فرجہم

یا صاحب الزمانؑ ادرکنی

خدمتگارانِ مکتبِ اهلبیت (ع)

سید حسن علی نقوی

حسّان ضیاء خان

سعد شمیم

حافظ محمد علی جعفری

Hassan

naqviz@live.com

﴿التماس سورة الفاتحہ﴾

سیدہ فاطمہ رضوی بنت سید حسن رضوی

سید ابوزر شہرت بلگرامی ابن سید رضوی

سید مظاہر حسین نقوی ابن سید محمد نقوی

سید محمد نقوی ابن سید ظہیر الحسن نقوی

سید الطاف حسین ابن سید محمد علی نقوی

سیدہ امّ حبیبہ بیگم

حاجی شیخ علیم الدین

شمشاد علی شیخ

مسیح الدین خان

فاطمہ خاتون

شمس الدین خان